در در ٹھوکر کھائے

(آپ بیتی)

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
فون: 7249218-7237430
E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : در در ٹھوکر کھائے
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ، لاہور
فون:7249218-7237430
اہتمام : ظہور احمد خاں
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
سرورق : عباس
پہلا ایڈیشن : 1996ء
دوسرا ایڈیشن : 1998ء
تیسرا ایڈیشن : 2001ء
چوتھا ایڈیشن : 2003ء
پانچواں ایڈیشن : 2005ء
قیمت : -/120 روپے

تمہیں خبر بھی ہے یارو کہ دشت غربت میں
ہم آپ اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں

(قابل اجمیری)

فہرست

1- پیش لفظ 7

2- آخری دن کی بات 9

3- ٹونک 12

4- حیدر آباد سندھ 40

5- لندن 88

6- بوخم 100

7- سندھ یونیورسٹی اور لاہور 121

8- واپسی کا سفر 140

9- تاثرات 152

پیش لفظ

جب میں نے اپنی یادداشتیں لکھنی شروع کیں تو ایک عجیب تجربہ ہوا۔ ایک بار ں پھر اپنے بچپن اور جوانی کے دور سے گزرا اور ایک ایک کر کے تمام گزرے واقعات یرے سامنے آتے رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سکرین پر فلم دیکھی جا رہی ہو۔ اس کے بعد ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ انسان ایک ہی زندگی میں کتنی بار مرتا ہے۔ میرا بچپن ر گیا' جوانی مر گئی' اب یہ واپس آنے والی چیزیں نہیں۔ انسان خود اپنی زندگی میں وت کا ذائقہ بار بار چکھتا ہے۔ غالب کا یہ شعر کس قدر برمحل ہے کہ

"مجھے کیا برا تھا مرنا جو ایک بار ہوتا......"

اور یہ بھی احساس ہوا کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے۔ یادوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور انسان بار بار ان یادوں میں کھوتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو انہیں یادوں کے سہارے زندہ رہنا پڑتا ہے۔

میری یہ یادداشتیں' میرے تاثرات پر مبنی ہیں' اس لئے میں نے قاری کو انہیں باتوں میں شریک کیا ہے کہ جہاں اس کی دلچسپی ہے۔ جو باتیں میری نجی زندگی سے ہیں' وہ میری ذاتی ملکیت میں' ان میں' میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔

ان یادداشتوں میں نہ تو اپنی شخصیت کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اور نہ اپنی غلطیوں کی معافی۔ یہ چند تجربات ہیں کہ جو آپ کے سامنے ہیں۔ میری شخصیت اور ذات ان کے پس منظر میں ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اگست 1996ء

لاہور

آخری دن کی بات

اب نہ تو مجھے وہ دن یاد ہے اور نہ تاریخ۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ 1952ء کا سال تھا اور موسم گرمیوں کا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا اور ڈوبتے سورج کی وجہ سے دیواروں کے سائے بڑھ رہے تھے۔ ہم وقت کا اندازہ ان سایوں سے ہی کرتے تھے۔ اس وقت گھر میں تمام رشتہ دار جمع تھے۔ باہر ڈیوڑھی میں والد کے دوست و احباب اکٹھے ہو گئے تھے۔ سامان باندھا جا چکا تھا۔ کوٹھریاں اور دالان خالی ہو گئے تھے۔ صرف چند پلنگ باقی رہ گئے تھے۔ اب لوگ انہی پلنگوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ ان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ انہی میں میری نانی منہ جھکائے، دوپٹہ میں چہرہ چھپائے، خاموشی سے سسکیاں لے رہی تھیں۔ یہی کچھ حال میری والدہ کا تھا۔ شاید ان سب کے دل میں ایک ہی سوال ہو کہ اب کے بچھڑے ہوئے پھر کب ملیں گے؟ یا یہ سوال بھی کہ شاید کبھی دوبارہ ملنا ہی نہ ہو اور یہ آخری ملاقات ہو۔

مجھے اس وقت قطعی اس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ جدائی اس قدر طویل اور لمبی ہو گی یا ہمیشہ کے لئے ہو گی۔ مجھے سفر کی بھی کوئی خوشی نہیں تھی۔ بس میں لوگوں کے درمیان کھڑا خاموشی سے اداس اور غمگیں چہروں کو دیکھ رہا تھا، جن میں سے بہت سوں کو اس کے بعد سے اب تک میں نے نہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت بھی تھی، لگاؤ بھی اور چاہت بھی، اور اس لئے جدائی کا غم۔

میں نے خالی دالانوں پر نظر دوڑائی اور پھر آخری بار گھر کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔

خالی خالی اجڑا گھر ایسا نظر آیا کہ شاید یہ بھی اس ماتم میں شریک ہے۔ میں اس حالت میں تھا کہ گھر سے سامان جانا شروع ہو گیا۔ باہر لاری کھڑی تھی۔ سامان کو اس کی چھت پر رکھ دیا گیا۔

اب ہم لوگوں کو جانا تھا۔ آخری بار گلے ملے۔ لوگ خاموشی سے روتے رہے۔ میں بھی اسی حالت میں گھر سے باہر نکلا۔ سامنے نکڑ پر حلوائی کی دکان تھی۔ یہاں میں محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ کیرم کھیلا کرتا تھا۔ وہ سب خاموشی سے کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے جا کر ملتا۔ ان کی طرف دیکھے بغیر میں خاموشی سے سر جھکائے لاری میں بیٹھ گیا۔

لاری رخصت ہوئی تو ڈیوڑھی اور گلی میں کھڑے لوگ آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں دھندلے دھندلے نظر آئے۔ جب لاری گلی سے مڑی تو یہ تمام چہرے یکدم غائب ہو گئے۔ جیسے جیسے لاری گھر کی دوری میں اپنی رفتار سے اضافہ کر رہی تھی، اسی طرح سے دل کا بوجھ بھی بڑھ رہا تھا اور دوبارہ سے ان جانے پہچانے چہروں کو دیکھنے کی امید کم ہو رہی تھی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے شہر کو آخری بار کس کیفیت کے ساتھ دیکھا۔ لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ شہر کی زندگی اسی طرح سے جاری تھی۔ وہی شوروغل، وہی ہنگامہ، اسی شہر کے ایک کونے میں کیا ہوا؟ شہر اس سے بے پرواہ تھا۔ لوگ اسی تیزی سے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ عمارتیں بھی سب کی سب اپنی جگہ تھیں۔ بازار کی رونقیں بھی ویسی ہی تھیں۔ کسی ایک یا چند افراد کے غم کو یہ شہر محسوس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لاری شہر سے باہر نکل گئی۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے کھڑکی سے باہر کوئی نظارہ کیا ہو۔ میرے لئے یہ سب بے معنی تھا۔ اس وقت یہ خیال نہیں آیا کہ ان نظاروں کو آخری بار دیکھ لوں۔ میرا دل بھرا ہوا تھا۔ لاری میں برقعہ میں لپٹی لپٹائی میری والدہ کی ہچکیوں کی آواز کبھی کبھی آ جاتی تھی۔ شام ہوتے ہوتے ہم نوائی کے سٹیشن پر پہنچے۔ جب ریل آئی تو

سامان کو چڑھایا گیا۔ سامان کی بہتات تھی۔ رسیوں سے بندھے بستر، ٹین اور لوہے کے صندوق، بوریوں میں بھرا سامان۔ میری والدہ نے ایک بورے میں سل بٹہ بھی باندھ لیا تھا۔ اس خیال سے کہ نئی جگہ میں یہ ملے یا نہ ملے۔ اس قدر سامان کہ پورا ڈبہ بھر گیا۔ بیٹھے ہوئے اور آنے والے مسافروں کو اس کی وجہ سے تکلیف تھی۔ ایک مسافر سے نہیں رہا گیا اور اس نے شکایتاً کہا: "کیا مصیبت ہے؟ دوسرے مسافروں کا کوئی بھی خیال نہیں۔" ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور مجرموں کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ مگر انہی میں سے ایک مسافر نے بڑی نرمی سے کہا: "انہیں کچھ نہ کہو بھائی! یہ پاکستان جا رہے ہیں۔"

☆

ٹونک

میں کس سنہ میں پیدا ہوا؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ میں نے جب بھی والدہ سے پوچھا تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ رمضان کا مہینہ تھا اور اس روز بہت زوردار بارش ہو رہی تھی۔ لہٰذا اب یہ مجھ پر تھا کہ میں خود اپنی تاریخ پیدائش کا تعین کروں۔ اس لئے جب سکول کا فارم بھرا تو میں نے 21 اپریل 1941ء اپنی تاریخ پیدائش درج کر دی۔ اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ میں اس دن پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ اب یہی میری تاریخ پیدائش ہے اور اسی سے میں اپنی عمر شمار کرتا ہوں۔

بہرحال میں اپنی پیدائش کی جگہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ ریاست ٹونک راجستھان کی ایک ریاست تھی کہ جس کے پہلے نواب امیر خاں تھے۔ امیر خاں ابتدائی انیسویں صدی کی ایک مشہور شخصیت تھے کہ جنہوں نے کرایہ کے سپاہیوں کو جمع کرکے ایک اچھی فوج تیار کر لی تھی۔ ان کا کام لوٹ مار تھا۔ جو انہیں پیسے دیتا یہ اس کے لئے لڑنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ یہ ایک عرصہ تک مراہٹوں کے ساتھ رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ لیکن جب کمپنی نے ایک ایک کرکے ہندوستان کی تمام طاقتوں کو شکست دے دی تو انہوں نے بھی اندازہ لگا لیا کہ ان کے لئے اب انگریزوں سے جنگ جاری رکھنا مشکل ہے۔ اودھر انگریزوں کی بھی خواہش تھی کہ ان سے جنگ کرکے کیوں پیسہ و فوج کا نقصان کیا جائے اس لئے دونوں میں صلح ہو گئی۔ اس کے عوض کمپنی نے انہیں راجستھان کی ایک ریاست دے دی کہ جس کا صدر مقام ٹونک تھا۔

جب امیر خاں اور ان ی فوج یہاں آ کر آباد ہوئی ہے تو اس وقت یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کا سائز بعد میں بھی کچھ زیادہ نہیں بڑھا۔ فوج کے مختلف حصوں نے اپنے اپنے محلّہ آباد کئے۔ مثلاً ایک محلّہ کالی پلٹن کہلاتا ہے۔ یہاں کالی پلٹن کے لوگ آباد ہوئے ہوں گے۔ بعد میں اور محلے آباد ہوتے رہے۔ ان ہی میں سے ایک محلّہ قافلہ تھا کہ جہاں میری نانی کی حویلی تھی۔ اس محلّہ میں سید احمد شہید کے ساتھی بالاکوٹ کی شکست کے بعد آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس لئے یہ قافلہ کہلایا۔ چونکہ سید احمد شہید نے نواب امیر خاں کی فوج میں ملازمت کی تھی، اس لئے ان کے اور نواب کے خاندان میں تعلقات تھے۔ جب وہ صوبہ سرحد گئے ہیں تو ٹونک ہوتے ہوئے گئے تھے۔ نواب نے ان کی مالی امداد بھی کی تھی۔ شاید کچھ پٹھان ان کی فوج میں شریک بھی ہوئے ہوں۔ بعد میں ان کے خاندان اور ان کی تحریک کے دوسرے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ چونکہ یہ لوگ وہابی کہلاتے تھے اس لئے انہوں نے قافلہ میں اپنی علیحدہ مسجد بنائی تھی۔ جہاں ان کے علاوہ دوسرے لوگ کم ہی نماز پڑھتے تھے۔

شہر میں کئی مسجدیں تھیں مگر اتنی بہتات نہیں تھی۔ جمعہ کی نماز صرف جامع مسجد میں ہوتی تھی۔ عید کی نماز عید گاہ میں۔ عید کی نماز بڑھانے کے لئے ہمارے استاد جو قاضی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر کالا لبادہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر، بڑی شان سے جایا کرتے تھے۔

اس وقت تک مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے رات کی خاموشی میں خصوصیت سے دور سے آتی ہوئی اذان کی آواز ایک تاثر پیدا کرتی تھی۔ مسجدوں میں دکانیں یا تو بالکل نہیں ہوتی تھیں یا ایک آدھ ہوتی تھی مگر مسجد کی حیثیت خالص مذہبی تھی، تجارتی نہیں۔

شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ بھی تھے اور ملے جلے بھی۔ میرے دادا کے بھائی اور ہمارے دو چچا محلّہ رجبن میں رہتے تھے۔ اس میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ نواب کی حویلی کے ساتھ جو آبادی تھی وہ شاگرد پیشہ کہلاتا تھا۔ ہم جس محلّہ میں رہتے تھے وہ امیر خاں کے نام پر محلّہ امیر گنج نام سے موسوم تھا۔

ہمارا گھر کچھ اس طرح سے تھا کہ یہ سب سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا تھا۔ ہمارے سامنے ننھے میاں کی حویلی تھی، جو بعد میں ٹونک کے آخری نواب بنے۔ اس کے چاروں طرف بڑی اونچی اونچی دیواریں تھیں، لہٰذا اس میں جو لوگ بھی رہتے تھے ان سے ہمارا کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

ہمارے گھر کے برابر جولاہوں کا محلّہ تھا جنہوں نے اپنے گھروں کو اس طرح سے بنایا تھا کہ ان کے محلّہ میں داخل ہونے کے صرف دو راستے تھے۔ باقی ہر طرف سے یہ بند تھا۔ ہمارے برابر جو مکان تھا، اس کی ایک دیوار میں موکھا بنا ہوا تھا۔ یہاں جا کر کبھی کبھی میری دادی پڑوسن کو آواز دیتی تھیں اور اس سے بات چیت کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ان کے لئے تفریح کا یہ واحد ذریعہ تھا۔ مکان کے پچھواڑے ایک میدان تھا کہ جس کے ایک کونے میں کسی کا مزار تھا۔ یہاں ہر جمعرات کو قوالی ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوہاروں کی گلی تھی۔ جہاں ان کی دکانیں تھیں اور ان دکانوں کے پیچھے ہی ان کے گھر تھے۔ اس میدان میں وہ گاڑیوں کے پہیوں پر لوہے کا فریم چڑھایا کرتے تھے۔ لوہے کا یہ فریم جلتے ہوئے اپلوں میں جب جل کر سرخ ہو جاتا تو یہ اسے پہیہ پر چڑھا کر پانی میں ڈال کر ٹھنڈا کرتے اور ہتھوڑے سے اس کو پہیہ میں فٹ کر دیتے تھے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا گھنٹوں اس عمل کو دیکھتا رہتا تھا۔ ہمارے مکان کے شمال میں رحموں کی مسجد تھی۔ اس کے موذن کا نام میستا تھا۔ مسجد میں وضو کے لئے ایک بڑا حوض تھا۔ اس کا پانی اس وقت بدلا جاتا تھا جب یہ گندا ہو کر کالا ہو جاتا تھا اور اس پر کائی جم جاتی تھی۔ مسجد کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اکثر یہاں مسافر بھی آ کر ٹھہر جاتے تھے۔ رمضان میں محلّہ کے تمام لوگ مسجد میں جمع ہو کر روزہ افطار کرتے تھے۔

ہمارا مکان آدھا کچا اور آدھا پکا بنا ہوا تھا۔ اس وقت ہر مکان میں ڈیوڑھی ہوتی تھی۔ مکان کے دروازے کھلے رہتے تھے، صرف رات میں انہیں بند کیا جاتا تھا۔ جب کوئی آتا تو یا تو دروازہ کھٹکھٹاتا تھا یا پھر ڈیوڑھی میں آ کر زور سے آواز دیتا تھا۔ ہمارے مکان کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ بیچ میں صحن اور اس کے تین جانب دالان تھے۔

دالانوں پر چھت نہیں تھی بلکہ کھپریل تھے۔ جو ڈھلوان کی صورت میں جما دیئے جاتے تھے تاکہ بارش کا پانی جمع نہ ہو اور نیچے گر جائے۔ سامنے والا حصہ پکا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چبوترہ تھا' اس کے بعد دالان۔ دالان کے دونوں جانب کوٹھریاں تھیں کہ جن میں گھر کا تمام سامان صندوقوں میں بند رکھا ہوتا تھا۔ کوٹھریوں میں ارد گرد مچان ہوتے تھے۔ یہ بھی سامان رکھنے کے کام آتے تھے۔ گرمیوں میں سب لوگ صحن میں سویا کرتے تھے۔ سردیوں مین دالان میں۔ جس کے دروازوں پر روئی کے بھرے ہوئے پردے ڈال دیئے جاتے تھے۔

مکان کے ایک حصہ میں باورچی خانہ تھا۔ اس وقت اپلے بطور ایندھن جلائے جاتے تھے۔ اپلوں کے ڈھیر میں سے اکثر سانپ' بچھو' کنکھجورے اور دوسرے کیڑے مکوڑے نکلتے رہتے تھے۔

اس وقت تک گھروں میں بجلی نہیں آئی تھی۔ گلیوں اور سڑکوں پر سرشام گیس کے لمپ جلا کرتے تھے۔ بعد میں جب بجلی آئی تو گلیاں اور سڑکیں روشن ہو گئیں۔

گھروں میں روشنی کے لئے لالٹین' موم بتی' یا دیے ہوتے تھے۔ میری دادی بڑی کفایت شعار تھیں اس لئے جب گلی کی نکڑ پر بلب لگا اور اس کی روشنی ان کے دلان میں آنے لگی کہ جہاں وہ رہتی تھیں تو انہوں نے خرچ کم کرنے کے لئے لالٹین جلانا چھوڑ دی۔

جس وقت میں نے اپنے دادا کو دیکھا ہے تو ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں موتیا کی شکایت ہوئی تھی مگر بروقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے نظر ختم ہو گئی۔ وہ لمبے' تڑنگے اور مضبوط جسم والے تھے۔ وہ ریاست جے پور میں پولیس کی ملازمت میں تھے۔ ان کے بڑے بھائی بھی پولیس افسر تھے۔ یہ دونوں ملازمت کی مدت ختم کرکے ٹونک میں آ گئے اور یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

ہمارے خاندان کی تاریخ جو مجھے معلوم ہے وہ دلچسپ ہے۔ یہ مغلوں کے زمانہ میں پشین سے ہندوستان آیا تھا اور ان کا تعلق قبیلہ ترین کی ایک شاخ طور ترین سے

تھا۔ پٹھانوں نے ہندوستان میں کرائے کے فوجیوں کا کردار ادا کیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کہ جب سیاسی انتشار ہوا اور مغلوں کے زوال کی وجہ سے کئی کئی ریاستیں بنیں لگیں تو پٹھان فوجیوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ہمارا خاندان دوسروں کے لئے لڑتا۔ جنگیں کرتا اور لوٹ مار کرتا ہوا' بالآخر سنبھل کے سرائے ترین میں آباد ہو گیا۔ یہاں پٹھانوں کی بڑی آبادی تھی جو روزگار کی تلاش میں پورے ہندوستان میں پھرتے رہتے تھے۔ امیر خاں جو بعد میں ٹونک کے نواب بنے۔ اگرچہ ترین تو نہ تھے۔ مگر ان کا گھر بھی سرائے ترین میں تھا۔ جب یہ نواب بنے تو بہت سے پٹھان خاندان سنبھل سے ٹونک چلے آئے۔ انہیں میں میرے دادا بھی تھے کہ جو ملازمت ختم کرکے آئے۔

کچھ یہ روایت رہی ہے کہ ہمارا گھرانہ صرف ایک نسل تک ایک جگہ رہا۔ میرے دادا نے سنبھل چھوڑا اور ٹونک آئے۔ میرے والد نے ٹونک چھوڑا اور ہجرت کرکے حیدر آباد سندھ آئے۔ میں نے حیدر آباد چھوڑ کر لاہور بسایا' اور اب میری اولاد دیکھیں کہا جاتی ہے۔ اس لئے نہ تو ہماری برادری ہے' نہ بڑا خاندان۔ اور نہ ہی کوئی آبائی قبرستان۔ ایک مسلسل ہجرت کا عمل ہے جو ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا ہے۔

آنکھوں کی بینائی جانے کے بعد میرے دادا کی زندگی معذوروں کی سی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بڑے سے ڈنڈے کے ساتھ گھر میں چلا پھرا کرتے تھے۔ زیادہ تر وقت خاموشی سے پلنگ پر لیٹے ہوئے گزارتے تھے۔ جب میں بڑا ہوا اور کتابیں پڑھنے لگا تو انہیں قصے' کہانیوں کی کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے پرانے قصے سنایا کرتے تھے۔ خاص طور سے ایک واقعہ بڑا سنسنی خیز لگتا تھا کہ جب انہوں نے تنہا کسی مشہور ڈاکو کو پکڑا تھا۔ ان کی زندگی سیدھی سادھی رہی۔ کیونکہ انہوں نے نہ تو کوئی جائیداد بنائی اور نہ ہی دولت اکٹھی کی۔ ان کے مقابلہ میں میری دادی بڑی ہوشیار اور زمانہ شناس خاتون تھیں۔ انہوں نے گھر کے اخراجات میں کفایت شعاری سے اتنا پس انداز کرلیا تھا کہ وہ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنیں اور اپنا خرچہ خود اٹھایا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان آئیں اور حیدر آباد' سندھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مرنے کے بعد ان کے پاس سے کئی اشرفیاں نکلیں جو انہوں نے حفاظت سے رکھ رکھیں تھیں۔

اس گھر میں ہمارے چھوٹے چچا بھی رہا کرتے تھے۔ یہ ملازمت کے سلسلہ میں اکثر ٹونک سے باہر رہا کرتے تھے۔ دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں ان کی حیثیت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ انگریزی لباس پہنتے تھے۔ سگریٹ پیتے تھے اور دوستوں سے انگریزی بولتے تھے۔ جو ہمارے لئے تعجب کی بات تھی۔ بعد میں پاکستان آنے والوں میں سب سے پہلے تھے۔ اس لئے ان کے بعد گھر میں صرف ہمارا خاندان رہ گیا تھا۔ میرے والد' دادا کی وجہ سے پاکستان نہیں آئے۔ حالانکہ جب ان کے دونوں بھائی پاکستان چلے گئے تو ان کا دل ٹونک سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسی لئے جب 1952ء میں میرے دادا کا انتقال ہوا تو کسی نے کہا تھا کہ "اب مسعود علی خاں یہاں نہیں رہیں گے۔" اور ہوا بھی یہی۔

میری نانی محلّہ قافلہ میں ایک بڑی حویلی میں رہتی تھیں۔ بڑے دروازے سے داخل ہوں تو گھیر آتا تھا' یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میں دائیں جانب دالان اور کوٹھریاں تھیں۔ صحن میں ایک کونے میں پختہ کوٹھری تھی۔ جو کسی زمانہ میں مالی پریشانیوں کی وجہ سے رہن رکھ دی تھی۔ یہ ایک بنئے کے پاس تھی۔ جو اس میں گھاس اور جانوروں کا چارہ رکھا کرتا تھا۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا مکان تھا جو خالی رہتا تھا۔ بارش کے موسم میں اس کے کچے صحن میں طرح طرح کے پودے اگ آتے تھے۔ خاص طور سے جنگلی مش روم قابل ذکر تھے۔ جنہیں ہم سانپ کی چھتری کہتے تھے۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے ڈیوڑھی تھی۔ پھر ایک بڑا صحن' دائیں جانب ایک اونچا چبوترہ۔ پھر دالان کے اندر دالان۔ اندرونی دالان کے دونوں جانب سامان رکھنے کے لئے کوٹھریاں۔ کوٹھریاں میں مچانوں پر میرے نانا کی کتابیں تھیں کہ جن کو پڑھنے سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے ایک دن میری نانی نے کہا کہ میں یہ کتابیں اپنے مدرسہ کے کتب خانے کو دے آؤں۔ جب مچان ان کتابوں سے خالی ہوئے تو اس کے ساتھ اس گھر سے علم و ادب کے آخری نشانات بھی ختم ہو گئے۔

اس وقت گھروں میں ڈرائنگ روم یا ڈائننگ روم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ گھروں میں زنانہ و مردانہ دو حصے ہوا کرتے تھے۔ اگر مردانہ حصہ نہیں ہوتا تھا تو مرد حضرات

ڈیوڑھی میں یا اس کے باہر مونڈوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ کھانا دالان یا چبوترے پر دسترخوان بچھا کر کھایا جاتا تھا۔ ان مکانوں میں نجی زندگی یا تنہائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔

میری والدہ کے دادا قصور سے آئے تھے۔ یہ مذہبی عالم تھے اور اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے اس وقت کے نواب کے استاد ہو گئے۔ اس کے عوض میں نواب نے انہیں حویلی، جاگیر اور نکاح پڑھانے کا حق دیا۔ میرے نانا نے اپنے باپ کی وراثت کو سنبھالا اور اپنا تعلق علم سے جوڑے رکھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میری والدہ بہت چھوٹی تھیں اس لئے انہیں اپنے باپ کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ میرے ماموں نے فارسی و عربی کی معمولی تعلیم حاصل کی، مگر اپنے خاندان میں علم کی میراث سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جاگیر سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ اس سے خوش تھے۔ مجھے تعجب ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی بے کاری میں کیسے گزاری؟ اگر ان کا کوئی شغل تھا تو وہ صفائی کا تھا۔ ان کا سارا وقت خود کو اور اپنی چیزوں کو صاف رکھنے میں گزر جاتا تھا۔ خاص طور سے وہ اپنی سائیکل کی صفائی میں صبح سے شام تک اس قدر مصروف رہتے تھے کہ حیرانی ہوتی تھی۔ اس پر سوار ہو کر وہ اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ اپنا اکثر وقت وہ ایک دو جاننے والوں کی دکانوں پر گزارا کرتے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ نہ تو بری صحبت میں پڑے اور نہ ہی فضول خرچی میں اپنا پیسہ برباد کیا۔ ہاں، اکثر وہ کسی کے کہنے پر اپنا پیسہ تجارت میں لگا دیتے تھے جو بعد میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ انہوں نے کبھی پاکستان آنے کا نہیں سوچا اور یہاں آ کر وہ کرتے بھی کیا۔ ان کی زندگی صرف ٹونک میں ہی گزر سکتی تھی۔ ہم سے ان کی خط و کتابت بھی کم ہی ہوتی تھی۔ جب تک نانی زندہ رہیں وہ لکھوایا کرتی تھیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ وہ ایک بار پاکستان آئے۔ وہ بھی اپنی بیوی کے اصرار پر کہ جن کی ایک بہن لاہور میں ہیں، شاید 1963ء میں۔ اس کے بعد جو گئے تو پھر کبھی نہیں ملے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے جب بیوی مریں تو تنہا رہ گئے اور سنا ہے کہ اس کے بعد وہ اپنا زیادہ وقت مسجد میں گزارنے لگے۔ جب ہم لاہور آئے تو 1992ء میں کسی کے ذریعہ اطلاع

ملی کہ ان کی وفات ہو گئی۔

نانی کے ساتھ ہمارا لگاؤ بہت زیادہ تھا۔ جب بھی ہم ان کے ہاں جاتے رات کو ان ہی کے ساتھ سویا کرتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہمیں قصے، کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ یہ ان کا دستور تھا کہ دسویں محرم کو وہ مرثیوں کی کتاب نکالتی تھیں اور جھوم جھوم کر مرثیے پڑھتیں اور زار و قطار رویا کرتی تھیں۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ہمیں ہمیشہ تعجب ہوا کرتا تھا۔ اس دن خاص طور سے وہ کھچڑا پکایا کرتی تھیں۔ وہ تمام تہوار اہتمام سے منایا کرتی تھیں۔ گیارہویں پر کونڈے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ نذر نیاز کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد گھر کو انہوں نے ہی سنبھالا تھا۔ مگر تھیں سیدھی سادھی، اس لئے سنا ہے کہ لوگ دھوکے سے ان سے پیسہ بٹورتے تھے۔ چونکہ حویلی بہت بڑی تھی، اس لئے وہ اپنے کسی نہ کسی رشتہ دار کو ضرور اس میں رکھتی تھیں تاکہ دو سراوٹ ہو جائے۔

حویلی کی پہلی منزل بڑی خوبصورت بنی ہوئی تھی۔ اس میں دو کمرے، دالان اور شہ نشین تھی۔ مگر یہاں کوئی رہتا نہیں تھا اور یہ پورا حصہ خالی پڑا رہتا تھا۔ سامنے والے دالان میں میری نانی کے رشتہ دار رہتے تھے، جنہیں ہم چھوٹے اور بڑے ماموں کہا کرتے تھے۔ ان کی والدہ کو “نانی کی اماں” یہ دبلی پتلی سی خاتون تھیں اور ہر وقت چرخہ کاتنے میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ بڑے ماموں پولیس میں ملازم تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بڑے اہتمام سے پان بنایا کرتے تھے۔ ایک بڑا کپڑا بچھا کر پانوں پر چونا و کتھا لگا کر رکھتے جاتے تھے۔ پھر انہیں احتیاط سے پانوں کی ڈبیہ میں بند کرتے تھے۔ جس انہماک اور چاہت سے وہ پان بناتے تھے، وہ ہمارے لئے دلچسپی کا باعث تھا۔

اب خیال آتا ہے کہ انسان کے لئے کوئی مشغلہ اختیار کرنا اور اس میں محو ہونا کس قدر ضروری ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو زندگی کے روزمرہ معمولات اور بیکار کاموں سے نجات دلا کر اس کے ذہن کو تروتازہ کرتا ہے۔ اس سے اس کی زندگی میں ایک مقصدیت آ جاتی ہے۔ میں دیکھتا تھا کہ جب وہ پان لگا کر انہیں نفاست سے اوپر تلے کرکے ڈبیہ میں رکھ لیتے تھے تو ان کے چہرے پر سکون و اطمینان آ جاتا

تھا۔ وہ اگلے دن کی بے لطف زندگی کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

چھوٹے ماموں کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ ایک کوٹھری میں ان کے کبوتر بھرے ہوئے تھے۔ جن کی غٹرغوں کی آوازیں حویلی میں گونجتی رہتی تھیں۔ انہیں اپنے کبوتروں سے عشق تھا۔ کبوتروں کے بچوں کو اپنے منہ میں دانے بھر کے کھلایا کرتے تھے۔ شام کو انہیں اڑایا کرتے تھے۔ جب یہ آسمان کی بلندیوں پر تیر رہے ہوتے تھے تو ان کی آنکھوں میں خوشی و مسرت کی چمک آ جاتی تھی۔ کبوتر انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیتے تھے۔

ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس لئے ان کے ہاں جوار کی روٹی پکتی تھی۔ یہ موٹی اور سخت ہوتی تھی۔ سبزی کے ساتھ کھانے میں اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ میں اکثر روٹی پکتے دیکھتا تھا کہ کس طرح توے پر اور پھر چولہے کی آنچ پر اس کو سینکا جاتا تھا۔ اس وقت اس میں سے جو بھینی بھینی خوشبو آتی تھی' وہ بھوک کو اور بڑھا دیتی تھی۔ میں اکثر تازہ پکی ہوئی روٹی کا ٹکڑا لے کر ایسے ہی روکھا کھا لیتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنی غربت سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ زندگی سے مطمئن تھے۔ سیدھی سادھی زندگی میں خواہشات کم تھیں۔ کم خواہشات کی وجہ سے زندگی میں سکون تھا۔

پھر یہ خبر سنی کہ نانی کے مرنے کے بعد ہمارے ماموں نے انہیں حویلی سے نکال دیا۔ یہ خبر سن کر میری والدہ کو بے انتہا افسوس ہوا۔ وہ ان کے ساتھ بچپن سے رہیں تھیں۔ اس لئے ان کے بغیر انہیں حویلی خالی خالی نظر آنے لگی۔ اب پتہ نہیں کہ یہ لوگ کہاں ہیں؟ زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ ہاں ان کی یادیں اور تخیل میں ان کے دھندلکے چہرے' ان کی حرکات و سکنات' ان کی باتیں' وہ ابھی تک ذہن میں ہیں' دھندلاتی ہوئی' مٹتی ہوئی۔

میری والدہ کا کہنا تھا کہ جب چھپن کا قحط پڑا تو عام لوگوں کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر اپنے بچوں تک کو فروخت کر دیا تھا۔ امراء اور پیسے والوں نے ہمیشہ کی طرح غریبوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے بچوں کو

خرید کر انہیں بطور غلام یا کنیز اپنی ملکیت بنا لیا۔ میری والدہ کا کہنا تھا کہ ان کی دادی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند لڑکیوں کو خرید لیا تھا۔ جنہیں وہ نیلے رنگ کے موٹے کپڑے پہنایا کرتی تھیں۔ یہ غریب لڑکیاں گھر کا سارا کام کاج کیا کرتی تھیں۔ یہ لڑکیاں اس گھر میں جوان ہوئیں اور پھر بوڑھی ہو کر مریں۔ نہ ان کی شادی ہوئی اور نہ یہ اپنے بچھڑے ماں باپ سے ملیں ان ہی میں سے ایک نے میری والدہ کو پالا تھا۔ وہ اسے آپا کے نام سے پکارتی تھیں۔ وہ جس محبت اور پیار سے آپا کا ذکر کرتی تھیں' اتنا اپنی والدہ کا بھی کبھی نہیں کیا۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آپا نے اپنی زندگی ان ہی کے لئے وقف کر دی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ ان کے گھر آتی اور گھر کا تمام کام کاج کر کے جاتی تھی۔ خدمت کرتے ہوئے ہی وہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میری والدہ نے زندگی بھر اسے یاد کیا' کیونکہ ان کا بچپن اور جوانی اس سے جڑی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کہ خود آپا اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟ اسے اپنی محرومیوں کا احساس ہو گا بھی کہ نہیں؟ یا قسمت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے اس نے خاموشی اور بغیر شکایت کے زندگی گزارنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ شاید جو محبت اس نے میری والدہ کو دی اور جو والدہ نے اسے دی' یہی اس کی کل پونجی ہو گی اور شاید اس کے سہارے اس نے زندگی گزار دی ہو گی۔

مگر یہ خیال آتا ہے کہ اگر کسی کی پوری زندگی دوسروں کی خدمت میں گزر جائے اور خود اس کی اپنی کوئی شناخت ہی نہ رہے' تو یہ اس کے لئے کس قدر اذیت ناک ہے۔ وہ ہزاروں لوگ جو بحیثیت غلاموں' کنیزوں اور ملازموں کے اپنی خواہشات کو دلوں میں چھپائے' ہزاروں محرومیوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے' اس کا ذمہ دار کون ہے؟ جب بھی ان مجبور' بے کس' لاچار اور محروم لوگوں کے بارے میں سوچا جاتا ہے تو دل میں مایوسی کے جذبات امنڈ آتے ہیں۔ کیا یہ انسان کا حق نہیں کہ وہ آزادی سے اس دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو؟ آخر کیوں وہ اس بات پر مجبور کیا جائے کہ دوسروں کو لطف اندوز ہوتے دیکھے۔ محروم لوگوں کے اس دکھ کو سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ اس لئے خدمت گزاری کی یہ روایت چلی جا رہی ہے۔

گھر میں میری والدہ کو صرف قرآن شریف پڑھایا گیا تھا۔ اس وقت تک عورتوں کے لئے تعلیم کو خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کا کام' گھریلو کام کاج اور بچوں کی پرورش ہوا کرتا تھا۔ پردے کا سخت رواج تھا۔ عورتوں کو گھر سے نکلنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ برقعہ اوڑھ کر بھی۔ اس وقت گھروں سے باہر صرف ہندو عورتیں نظر آتی تھیں وہ بھی لمبے گھونگھٹ سے اپنے چہروں کو چھپائے ہوئے۔

جب عورتیں کہیں جاتیں' تو ان کے لئے بیل گاڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ ایک عجیب و غریب قسم کی گاڑی ہوتی تھی۔ بانسوں سے بنی ہوئی پلنگ نما چیز جسے ماچھ کہتے تھے' چاروں طرف پردوں سے گھری ہوتی تھی۔ پردوں کے دائیں بائیں برقعہ کی طرح دو چھوٹی چھوٹی جالیاں ہوتی تھیں کہ اندر بیٹھی عورتیں ان کے ذریعے سے باہر کی دنیا دیکھ سکیں۔ کچھ انتہا پسندوں کو عورتوں کی یہ آزادی بھی پسند نہیں تھی۔ جب بھی میری والدہ کو نانی کے گھر یا کہیں اور جانا ہوتا تھا' تو ہم اڈے سے جا کر گاڑی لے آتے تھے۔ سوار ہوتے وقت دونوں طرف سے چادر تان کر پردہ کیا جاتا تھا اور یہ نعرہ لگایا جاتا تھا کہ عورتیں سوار ہو رہی ہیں لہذا اگر گلی میں کوئی آ رہا ہوتا تھا تو وہ وہیں خاموشی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جب عورتیں سوار ہو جاتیں تو بچے گاڑی کے پردے پیچھے کر کے اس کے سامنے بیٹھ جایا کرتے تھے تاکہ باہر کی دنیا کا نظارہ دیکھتے ہوئے جائیں۔ شہر میں ایک گاڑی بان تھے جو ننھے خاں کے نام سے مشہور تھے۔ یہ سولر ہیٹ پہن کر گاڑی چلایا کرتے تھے۔ جب کسی نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ اس طرح انگریزوں کو ذلیل کرتا ہوں۔ اس سے پتہ تو یہی چلتا ہے کہ گاڑی بان کا پیشہ کوئی باعث عزت نہیں تھا۔ چاہے اس کو چلانے والا کوئی پٹھان ہی کیوں نہ ہو۔

میرے والد کی تعلیم روائتی طور پر ہوئی تھی۔ انہوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس کا پتہ مجھے اس وقت چلا کہ جب ان کے کاغذات میں کسی حکیم کی سند ملی جو انہوں نے والد کو دی تھی اور یہ حق دیا تھا کہ وہ علاج کر سکتے ہیں لیکن والد نے اس حق کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کا اردو خط بڑا خوبصورت اور پختہ تھا۔ آج کل کے لوگوں کے لئے تو اس کا پڑھنا بھی مشکل ہوگا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ

ریاست میں توشہ خانہ میں ملازم تھے۔ جب میں تھوڑا بڑا ہوا تو اکثر ان کے ساتھ نواب کے محل جایا کرتا تھا۔ یہ "نذر باغ" کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں نواب کی رہائش بھی تھی اور ریاست کے دفاتر بھی۔ یہاں میں نے والد کے ایک ساتھی سے جو ان کے ساتھ کام کرتے تھے، پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں دری یا ڈوریہ کا فرش ہوتا تھا۔ لکھنے کے لئے چھوتی میزیں یا تپائیاں، جن پر قلم، دوات اور بلاٹنگ پیپر رکھے ہوتے تھے۔ میرے یہ استاد ریاست کے ریٹائرڈ ملازمین کو پنشن دیا کرتے تھے۔ پنشن لینے والے سلاخوں کے دروازہ پر آتے تھے۔ یہ کاغذ پر دستخط کراتے یا انگوٹھا لگواتے اور پنشن کے دو یا تین روپیہ انہیں دے دیتے تھے۔ جب انہیں کسی چیز کی یا کسی کام کی ضرورت ہوتی تھی تو یہ آواز لگاتے تھے "ہرکارے، ہرکارے" ان کی اس آواز پر ملازم بھاگتا ہوا آتا تھا۔ انہیں پانی پلاتا، دوات میں سیاہی بھرتا یا کاغذات ادھر سے ادھر لے جاتا۔ اس وقت تک "ہرکارہ" کے معنی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ غریب ہر کام کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ وہی پوزیشن جو آج چپڑاسی یا پٹہ والے کی ہے۔

اس وقت تک اس بات پر بڑا زور دیا جاتا تھا کہ تحریر خوبصورت ہو۔ اس کے لئے تختی پر لکھنا ضروری تھا۔ جب دفتر میں، میں تختی دھونے کے لئے جاتا، تو اکثر نواب صاحب اپنے محل سے آتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ تیز تیز چلتے آتے۔ ان پر ایک ملازم چھتری کا سایہ کئے ہوئے ہوتا تھا۔ یہ ادھر ادھر بالکل نہیں دیکھتے تھے۔ اس لئے ان سے کبھی سلام دعا نہیں ہوئی۔ میں جب بھی انہیں آتا دیکھتا تو تختی اور ملتانی مٹی کو چھوڑ کر ان کی رفتار کو دیکھنے لگتا تھا۔ وہ عمارت کے بیچوں بیچ ایک کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ شاید وہاں کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوں۔

نذر باغ کی رونق سال میں ایک بار عید میلادالنبیؐ کے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ اس موقع پر بارہ دن تک میلاد ہوا کرتا تھا اور رات کو پوری عمارت کو چراغاں کیا جاتا تھا۔ پورے شہر کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ یہاں آ کر چراغاں سے لطف اندوز ہو۔ بارہ دن تک ہر آنے والے کو دو بڑے بڑے لڈو دیئے جاتے تھے۔ مگر شرط یہ تھی کہ صدر دروازے سے آئے۔ جو چھوٹے دروازے سے آتے تھے وہ بغیر لڈوؤں کے تفریح

کرتے تھے۔ اس لئے صدر دروازے پر اژدہام ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں بھی اس اژدہام میں شامل ہو کر اندر داخل ہوا تو کسی نے میرے ہاتھ میں دو لڈو تھما دیئے۔ جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو یہ میرے والد تھے۔ بعد میں انہوں نے ہمیں وہ بڑا کمرہ دکھایا کہ جہاں لڈو تیار ہو کر رکھے جاتے تھے۔ یہ فرش سے چھت تک چنے ہوئے تھے چونکہ والد لڈو تقسیم کرنے والوں میں سے تھے‘ لہٰذا ہمیں لڈوؤں کا زیادہ ہی حصہ مل جاتا تھا۔ ان بارہ دنوں میں ہم جی بھر کے لڈو کھاتے تھے۔ جب یہ لڈو خشک ہونے لگتے تو والدہ ان میں گھی ڈال کر ان کا حلوہ بنا لیتی تھیں جو اور ذائقہ دار ہو جاتا تھا۔

ریاست کا کتب خانہ بہت اچھا تھا۔ کہتے ہیں کہ نواب محمد علی خان کو کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے قیمتی مسودے اور کتابیں جمع کیں تھیں۔ بعد میں اختلافات کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں جلاوطن کر دیا تھا۔ جلاوطنی کی یہ زندگی انہوں نے بنارس میں گزاری۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی کتابیں ریاست کے کتب خانہ کو مل گئیں۔ میں نے ایک بار غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رباعی دیکھی تھی جو انہوں نے نواب وزیر الدولہ کی تعریف میں لکھی تھی۔ اس رباعی اور اس کے پس منظر پر میرے ایک استاد منظور میاں نے رسالہ آجکل میں ایک مضمون بھی چھپوایا تھا۔

میرے والد کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ کتب خانہ سے جو کتابیں لاتے تھے ان میں طلسم ہوشربا‘ داستان امیر حمزہ اور داستان شجاعت قسم کی کتابیں ہوتی تھیں۔ میں نے انہیں کتابوں سے اپنی پڑھائی شروع کی۔ اس وقت جادوگری اور عمرو عیار کے قصے کہیں سے کہیں لے جاتے تھے۔ میں مدرسہ سے آ کر گھنٹوں پلنگ پر لیٹا ہوا یہ کتابیں پڑھتا اور سحر و جادوگری کی دنیا میں گم ہو جاتا تھا۔ ان کتابوں نے میری تخیل کی پروازی میں بہت اضافہ کیا۔ جنوں‘ پریوں اور طلسمات کے یہ قصے اس وقت حقیقی لگتے تھے اور خواہش ہوتی تھی کہ ہم خود بھی ان کا ایک حصہ بن جائیں۔

ٹونک کا یہ قیمتی کتب خانہ ضائع نہیں ہوا۔ ہندوستان کی حکومت نے اب عربی و فارسی کے ان مسودوں پر مشتمل کتب خانہ کو انسٹیٹیوٹ بنا دیا ہے۔

ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ٹونک میں شریعت کا نظام نافذ تھا اور فیصلے اسلامی

قوانین کے تحت ہوا کرتے تھے۔ شاید شریعت صرف دفتر تک محدود ہو اور مفتی و قاضی کے عہدوں سے اس کا تعلق ہو، عملی طور پر تو اس کا نفاذ مشکل تھا لیکن مذہبی فضا ضرور تھی۔ کم از کم ظاہری طور پر۔ رمضان کے مہینے میں سارے بازار بند ہوتے تھے اور کھانے پینے کی کوئی چیز فروخت نہیں ہوتی تھی۔ گھروں میں لوگ کھانا نہیں پکاتے تھے۔ اس وقت مصیبت یہ تھی کہ جب چولہا جلایا جاتا تھا تو لکڑیوں یا اپلوں کے جلنے سے گھر سے دھواں اٹھتا تھا۔ اس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ گھر میں کھانا پک رہا ہے۔ اس لئے روزہ خور یا تو باسی کھانا کھاتے تھے، یا سحری و شام کے کھانے پر اکتفا کرتے تھے۔

سحری و افطاری کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا۔ اس وقت برف مہنگی ہوا کرتی تھی۔ میرے والد جب دفتر سے آتے تو ساتھ میں برف لایا کرتے تھے، جسے فوراً دھو کر تھرموس میں بھر دیا جاتا تھا اور اسے بڑی کفایت شعاری سے استعمال کیا جاتا تھا۔ افطار کے وقت افطاری بنا کر ضرور مسجد میں بھیجی جاتی تھی۔ جہاں محلّہ کے لوگ مل کر روزہ کھولتے تھے۔

برف کے علاوہ پانی کو ٹھنڈا کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے آب خوروں میں پانی بھر دیا جاتا تھا اور پھر انہیں ایک جھولے میں رکھ کر ہلایا جاتا تھا تاکہ ہوا کے اثر سے یہ ٹھنڈے ہو جائیں۔ پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے کورے مٹکے اور صراحیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ پانی گلاس کی بجائے کٹورے میں پیا جاتا تھا۔ اس پر قلعی کرائی جاتی تھی تاکہ صاف اور چمکدار رہے۔

میرے لئے عید کے تہوار کی یاد اس لئے ہے کہ اس موقع پر ہمیں نئے جوتے پہنائے جاتے تھے۔ اس لئے جب ہم جوتوں کی دکان میں داخل ہوتے تو نئے جوتوں کی مہک بڑی اچھی لگتی تھی۔ پیر میں جب نیا جوتا آتا تو ایک عجیب سی خوشی و مسرت ہوتی تھی۔ اس بات کی اجازت نہ تھی کہ عید سے پہلے ان جوتوں کو پہنا جائے۔ اس لئے میں صبح سویرے جب کہ دوسرے لوگ سو رہے ہوتے تھے، نئے جوتے پہن کر دالان میں چکر لگایا کرتا تھا اور نئے جوتوں کی چمک، ان کی چرمراہٹ اور ان کی تازگی سے

لطف اندوز ہوتا تھا۔

والد زیادہ تر نری کے جوتے پہنتے تھے۔ یہ سلیم شاہی قسم کے ہلکے جوتے ہوتے تھے۔ جو مشکل سے مہینہ بھر چلتے تھے۔ موسم کے لحاظ سے وہی مناسب ہوتے تھے۔ ہمارے گھر کے قریب جوتوں کی دکانیں تھیں جہاں نری کے جوتے فروخت ہوتے تھے۔ ان جوتوں میں سیدھے اور الٹے پاؤں کا کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

عید کے روز ریاست کی جانب سے ایک شاندار جلوس نکلا کرتا تھا۔ اس میں فوج کی مختلف پلٹنیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ کندھوں پر برہنہ تلواریں یا بندوقیں رکھے قلعہ سے مارچ کرتے ہوئے عیدگاہ تک جاتے تھے۔ جلوس میں پالکیاں' گاڑیاں اور ہاتھی و گھوڑے بھی ہوا کرتے تھے۔ بچپن میں عید کے جلوس کا نظارہ بڑی دلچسپی کا باعث ہوا کرتا تھا۔ ہم شہر کی اس سڑک پر کہ جہاں سے یہ جلوس گزرتا تھا' وہاں درزی کی دکان کی چھت پر کھڑے ہو جاتے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جلوس کو گزرتا دیکھتے تھے۔

اب اندازہ ہوا کہ کیوں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جلوسوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی طاقت و قوت' دولت اور شان و شوکت کو ظاہر کرتے تھے تاکہ دیکھنے والے ان سے مرعوب ہو جائیں۔ لیکن جہاں لوگوں میں حکمران کی طاقت کا ڈر اور خوف بیٹھتا تھا' وہیں ان میں فخرو مباہات کے احساسات بھی پیدا ہوتے تھے کہ ان کا حکمران کس قدر عظیم و طاقتور اور دولت مند ہے۔ ان جلوسوں کا سلسلہ 1947ء کے بعد کچھ سال جاری رہا' مگر پھر نہ نواب رہے اور نہ ہی ان کی شان و شوکت۔ اب یہ سب تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

ٹونک میں اس وقت تک کم ہی لوگ ہوں گے جو انگریزی لباس پہنتے ہوں۔ انگریزی بال رکھنے کا رواج کم تھا۔ عام لباس میں علی گڑھ کٹ پاجامہ' قمیض اور شیروانی ہوتی تھی۔ والد جب دفتر جاتے تھے تو گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم شیروانی پہن کر جاتے تھے۔ اکثر ٹھنڈے کپڑے کا بنا ہوا کوٹ بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں رام پوری ٹوپی کا رواج تھا۔ کچھ لوگ پھندوں والی ترکی ٹوپی بھی پہنتے تھے۔ کوئی

بھی گھر سے ننگے سر نہیں نکلتا تھا۔ گھر میں بھی جب کوئی بزرگ آتے تو فوراً ٹوپی اوڑھ کر ان کے سلام کے لئے جاتے تھے۔ خاص موقعوں پر، دربار میں جاتے وقت، لوگ پگڑیاں بھی باندھتے تھے۔ میرے والد کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے جب وہ شکار پر جاتے تو خاکی زین کی برجس اور خاکی رنگ کا کوٹ پہنتے تھے۔

ریاست ٹونک کی سرکاری زبان اردو تھی۔ شہر میں ادبی سرگرمیاں خوب تھیں۔ شاعروں کی بہتات تھی۔ ہر پڑھا لکھا شاعری کو ذریعہ عزت سمجھتا تھا۔ جو شاعری نہیں کر سکتے تھے وہ کسی کے شاگرد ہو کر اس سے شعر لکھواتے اور مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتے تھے۔ مشاعروں کا رواج تھا۔ میں چونکہ چھوٹا تھا اس لئے ٹونک کے کسی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوا۔ سال میں ایک مرتبہ بڑا مشاعرہ ہوتا تھا جس میں پورے ہندوستان سے مشہور شاعر شریک ہوا کرتے تھے۔ ٹونک نے مشہور شاعر بھی پیدا کئے۔ ان میں کچھ مشہور ہوئے اور کچھ بغیر شہرت کے ہی رہے۔ والد سنایا کرتے تھے کہ ایک صاحب تھے جو "ور" تخلص رکھتے تھے۔ خود شعر نہیں کہہ سکتے تھے اس لئے کسی سے لکھواتے تھے۔ لوگوں میں "استاد ور" مشہور تھے۔ ایک مرتبہ کسی مشاعرہ میں شعر پڑھا، مجمع میں سے کسی نے بطور مذاق کہا "استاد اس کے معنی کیا ہیں؟" استاد نے بھی برجستہ کہا کہ "پہلے شعر سنو، معنی اس میں ابھی نہیں ڈالے ہیں؟"

چونکہ ٹونک میں پٹھانوں کی اکثریت تھی اس لئے یہ لوگ اپنے ساتھ چار بیت کی روایت لے کر آئے تھے۔ شام یا رات کو خاموشی میں جب دف پر یہ چار بیتوں کو گاتے تھے تو ایک عجیب سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ میں نے چار بیتیں پہلی مرتبہ حیدر آباد سندھ میں سنیں۔ میرے رشتہ کے چچا اس ٹیم کے سربراہ تھے۔ ان کے گانے کا انداز بڑا جوشیلا اور جذبات سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ میرے چچا زاد بھائی واجد علی ان کے لئے چار بیتیں لکھتے تھے اور بہت سی دوسری روایات کی طرح چار بیتوں کا فن بھی اب خاتمہ پر ہے۔

شہر میں دربار ہائی سکول کے نام سے میٹرک تک تعلیم کے لئے ایک سکول تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لوگ علی گڑھ، الہ آباد یا دوسرے شہر جایا کرتے تھے۔ شہر میں دینی مدرسوں کی بہتات تھی کہ جہاں قرآن، حدیث، عربی و فارسی زبانوں کی تعلیم ہوتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم قرآن شریف کے ناظرہ پڑھنے سے ہوئی۔ والد کو ہماری تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے نہ تو انہوں نے ہمیں کسی سکول میں داخل کرایا اور نہ ہی ہم سے پوچھا کہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ میرے پھوپھا زاد بھائی نے ایک دن مجھے دارالعلوم خلیلیہ میں داخل کرا دیا۔ یہاں کئی استاد قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ میرے استاد کا نام "بنّے خاں" تھا۔ بڑے سخت و جابر استاد' جیسا کہ مذہبی استاد ہوتے ہیں۔ ہماری کلاس ایک دالان میں ہوتی تھی کہ جہاں ہم سب لوگ ڈوریہ پر آمنے سامنے دو قطاروں میں بیٹھ جاتے تھے اور سپاروں کو رحل پر رکھ کر زور زور سے ہل ہل کر سبق یاد کرتے۔ حافظ صاحب دالان کے شروع میں ڈنڈا ہاتھ میں لئے بیٹھے ہوتے تھے۔ آٹھ' دس طالب علم ان کے اردگرد ہوتے تھے جو قرآن حفظ کرتے ہوتے تھے۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے انہیں سنتے رہتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی اور انہوں نے اس کی پیٹھ پر ڈنڈا رسید کیا۔ جو طالب علم سبق یاد کر نہیں پاتے تھے' انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان کی چھٹی بند کر دی جاتی تھی اور انہیں کھانا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی بہت سے استاد طالب علموں کے پیروں میں زنجیریں باندھ کر اپنے گھروں پر رکھتے تھے۔ اس لئے مدرسہ کا تصور بچپن ہی سے عقوبت خانہ یا جیل کا تھا۔

صبح جب حافظ بنّے خاں گھر سے آتے تھے تو ان کے ساتھ قرآن حفظ کرنے والے چار یا پانچ طالب علم ہوا کرتے تھے۔ جو راستہ میں انہیں قرآن سناتے آتے تھے۔ اس سے حافظ صاحب کی شہرت بھی ہوتی تھی۔ لہٰذا اس روایت کو سب ہی استادوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ چونکہ بہت سارے دینی مدرسے تھے۔ اس لئے ٹونک میں قرآن کے حافظوں کی بڑی تعداد ہو گئی تھی۔ رمضان کے مہینے میں تراویح پڑھانے کے لئے یہ حفاظ پورے ہندوستان میں پھیل جاتے تھے۔ عید کے بعد واپسی پر رقم' تحفے تحائف لے کر آتے تھے۔ اس طرح تراویح پڑھانا بعض کے لئے آمدنی کا واحد ذریعہ تھا کہ جس کے سہارے وہ پورا سال گزارتے تھے۔

دارالعلوم خلیلیہ کا نام ٹونک کے نواب ابراہیم خاں کے نام پر تھا کہ جن کا تخلص

خلیل تھا۔ اس کے بانیوں میں حکیم برکات احمد تھے جو کہ اپنے زمانے کے ایک جید عالم مانے جاتے تھے۔ ان کی شخصیت کی وجہ سے اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نوجوان طالب علم نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور وسط ایشیا سے بھی آتے تھے۔ غیر ملکی طالب علموں کی بڑی تعداد کو رکھنا اور ان کے کھانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ ان طالب علموں کو صاحب استطاعت لوگوں کے گھروں پر ٹھہرا دیتے تھے۔ جو طالب علم مدرسہ میں رہتے تھے، ان کا کھانا مختلف گھروں پر لگوا دیا تھا۔ لہٰذا ہمارے گھر میں ایک طالب علم کھانا لینے آتا تھا۔ مغرب کے وقت وہ ڈیوڑھی پر آ کر آواز لگاتا تھا "طالب علم کا کھانا" اور گھر میں جو بھی پکا ہوتا، اس کے ٹفن میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اس لئے بچپن میں طالب علم کا جو تصور ذہن میں تھا وہ یہ کہ جو گھر پر کھانا لینے آتا ہو اس لئے ایک مرتبہ کسی نے مجھے طالب علم کہہ دیا تو میں سخت ناراض ہوا اور فوراً" تردید کی میں طالب علم نہیں ہوں۔

اب سوچتا ہوں کہ الفاظ چاہے کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں اور ان کے معنی کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ان کے استعمال سے ان کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ جرمنی میں غیر ملکی مزدوروں کے لئے "مہمان مزدور" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر جرمن لوگوں میں غیر ملکی کام کرنے والوں کے لئے جو حقارت ہے، اس کی وجہ سے یہ لفظ باعث ذلت بن گیا ہے۔ جب تک کسی کا سماجی رتبہ نہیں بڑھے گا، اس وقت الفاظ کے ذریعے اس کو باعزت نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں چپڑاسی کو قاصد کہیں یا نائب قاصد، اس کا سماجی مرتبہ ہر اچھے لفظ کے مفہوم کو بدل دے گا۔ اس لئے میرے ذہن میں طالب علم وہ تھا کہ جو سرحد یا افغانستان سے آیا ہو، غریب و نادار ہو اور گھر گھر جا کر اپنے لئے کھانا مانگتا ہو۔

مدرسہ کی عمارت وسیع اور کشادہ تھی۔ اس کے دائیں و بائیں جانب بڑے بڑے دالان تھے جن میں ڈوریے بچھے ہوتے تھے۔ اس کا کتب خانہ ایک بڑے کمرے میں تھا کہ جس میں پتھروں کی سلوں پر کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ زیادہ تر کتابیں مذہبی موضوعات پر تھیں جب کسی عالم کے مرنے کے بعد اس کی کتابیں وارثوں پر بوجھ بننے

لگتی تھیں تو وہ انہیں یا تو کسی ردی فروش کو دے دیتے تھے یا مدرسہ کو۔ مدرسہ کے کتب خانہ میں ان کتابوں کا بھی ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کتابوں کی کوئی باقاعدہ فہرست نہیں تھی۔ سنا ہے کہ یہاں کچھ قیمتی اور نایاب کتابیں بھی تھیں کیونکہ ایک مرتبہ ایک مصری عالم کسی کتاب کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اس نے ہمارے سامنے ہی اس کتاب کی کیمرے سے فوٹو لئے تھے۔

مدرسہ میں غیرنصابی سرگرمیوں میں صرف بیت بازی ہوا کرتی تھی اس لئے میں نے بہت اشعار یاد کر لئے تھے۔ جو پاکستان آنے تک یاد رہے۔ مگر جب ان کا استعمال نہیں ہوا تو آہستہ آہستہ بھولتا چلا گیا۔

صبح صبح جب میں مدرسہ جاتا تو گرمیوں کے دنوں میں بیل گاڑیوں اور گدھوں پر لدے ہوئے خربوزے بازار میں آتے تھے۔ ان کی خوشبو سے پورا بازار مہک رہا ہوتا تھا۔ ٹونک کے خربوزے بڑے مشہور تھے۔ (شاید اب بھی ہوں) سستے اتنے کہ امیرو غریب سب کو بہ آسانی میسر آ جاتے تھے۔ غریب تو اس کے ساتھ روٹی بھی کھا لیتے تھے۔ صدر بازار کے دونوں جانب دکاندار ان خربوزوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ گاہک خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر ان کی مٹھاس کا اندازہ لگاتے تھے۔ شاید ان خربوزوں کی مٹھاس کی وجہ بناس ندی کا پانی ہو، کیونکہ اس ندی پر خربوزوں کی بیلیں ہوتی تھیں۔ میرے والد نے ایک بار خربوزوں کی باڑھ پر سب رشتہ داروں کو جمع کیا تھا۔ اس کی دھندلی یاد اب تک ذہن میں ہے۔ ندی کا صاف ستھرا و شفاف پانی۔ ٹھنڈی ریت، نشہ آور ٹھنڈی ہوا، اور پھر خربوزے۔ ایسے موقعوں پر عورتیں صحیح معنوں میں تفریح کرتی تھیں۔ کیونکہ گھروں کی گھٹن سے نکلنے کے مواقع انہیں کم ہی ملتے تھے۔ کبھی کبھی بچوں اور بڑوں میں مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کا خربوزہ میٹھا ہے۔ اس کی مٹھاس چکھنے کے لئے ٹاچی لگائی جاتی تھی۔ اگر ذائقہ خراب ہوتا تو اسے پھینک دیا جاتا تھا۔

خربوزوں کے ساتھ ساتھ تربوز بھی ہوتے تھے جنہیں متیرہ کہا جاتا تھا۔ راجستھان میں پھل کم ہی ہوا کرتے تھے۔ امرود، گولر اور بیر خوب ہوتے تھے۔ بیر دو قسم کے

ہوتے تھے۔ ایک وہ جو بیری کہلاتے تھے اور دوسرے جو درخت پر لگتے تھے۔ کیلا، سیب اور انگور بڑے مہنگے ہوا کرتے تھے۔ انگوروں کے دو یا تین دانے روئی میں رکھ کر انہیں ڈبیوں میں بند کرکے لاتے تھے جیسے کہ وہ قیمتی موتی یا نگینہ ہوں۔ اس لئے پھلوں کے استعمال کو ڈاکٹر بطور دوا استعمال کرتے تھے۔

گرمیوں میں سب سے سستا برف کا گولا ہوتا تھا۔ جست کی نلکیوں میں بھری قلفیاں، اور سب سے مہنگی برف ملائی۔ اسے کپڑے کی تہوں میں ڈھک کر رکھا جاتا تھا اور درخت کے صاف ستھرے پتہ پر اس کی پھانکیں کاٹ کر دی جاتی تھیں۔ اس کی مقدار اس قدر کم ہوتی تھی کہ اس سے کبھی نیت نہیں بھرتی تھی۔

شہر کے صدر بازار میں جگہ جگہ سبیلیں لگی ہوتی تھیں۔ ان سبیلوں کا انتظام کرنے والے سب ہندو تھے۔ ان میں کورے مٹکوں میں ٹھنڈا پانی بھرا ہوتا تھا۔ مٹکوں کے منہ پر صاف ستھری صافی بندھی ہوتی تھی۔ جب کوئی پانی پینے جاتا تو وہاں بیٹھا ہوا آدمی ڈونگے سے پہلے اس کے ہاتھ دھلاتا، پھر وہ اوک سے پانی پیتا، جب سیر ہو جاتا تو اپنا سر ہلا دیتا تھا۔

ہر جمعرات کو شہر میں بازار لگا کرتا تھا۔ اس روز لوگ کاٹھ کباڑ اور تمام بیکار چیزیں لا کر بازار میں رکھ دیتے تھے۔ بعض اوقات یہاں نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول مل جایا کرتی تھیں۔ شہر میں تازہ سبزی روز عصر کے وقت قریبی گاؤں کی عورتیں لاتی تھیں۔ ان کے ٹوکروں میں تازہ سبزی کی خوشبو سے بازار مہک جاتا تھا۔

گلیوں میں جو کھیل کھیلے جاتے تھے ان میں گولیاں تھیں، جنہیں ہم انٹے کہا کرتے تھے۔ لٹو کو بھوریا بولتے تھے جہاں بھوریاں بنتی تھیں میں وہاں کھڑے ہو کر ان کو بنتا ہوا دیکھتا تھا۔ لکڑی کے ایک سادہ ٹکڑے کو لے کر اسے ہاتھ سے چلنے والی خراد کی مشین پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ پھر ایک تیز دھارے سے اسے تراش خراش کر بھوریا بنائی جاتی تھی، پھر اس پر حسب خواہش رنگ ہوتے تھے۔ تخلیق کا یہ عمل بڑا مسحور کن اور لطف آمیز ہوا کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کا ٹکڑا ایک خوبصورت اور رنگین بھوریا

کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

ٹونک میں پتنگ بازی کا بھی خوب رواج تھا۔ پتنگ بازی کے موسم میں چھت پر چڑھ کر پتنگ اڑائے جاتے تھے۔ مانجھے بنانے میں بھی خوب محنت کی جاتی تھی۔ اگرچہ پتنگ بازی کے اپنے اخلاقی اصول تھے، مگر لوگ ان کو نظرانداز کر کے بے ایمانی سے کام لیتے تھے۔ کچھ لوگ مچھلی پکڑنے کی موٹی ڈور سے مانجھا بناتے اور اسے پتنگ بازی میں استعمال کرتے تھے۔ جو لوگ پتنگوں کو پھنسا کر انہیں کھینچ لیتے تھے انہیں برا سمجھا جاتا تھا۔

میرے شوقوں میں سے ایک شوق پدیوں کو پالنا تھا۔ یہ رنگ برنگی پدیاں پنجرہ میں پھدکتی ہوئی بڑی خوبصورت لگتی تھیں۔ پنجرہ میں ایک حصہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس میں نئی پدیوں کو پکڑا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لئے پنجرہ کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔ جب اس کے اندر پدیاں بولتیں۔ تو دوسری پدیاں ان آوازوں کو سن کر اس ٹریپ میں آ جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ میں نے کچھ دن بٹیریں بھی پالیں۔ اس کی وجہ ہمارے رشتہ کے ایک چچا تھے جنہیں ہم مما کہا کرتے تھے۔ وہ بٹیروں کے بڑے شوقین تھے۔ جنگل میں جا کر اور جال لگا کر وہ انہیں پکڑتے تھے۔ پھر ان کو سدھاتے تھے۔ اکثر انہیں لڑنے کے لئے تیار بھی کرتے تھے۔ میں ان سے دو ایک بٹیریں لے لیتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ کچھ لوگ ان سدھی ہوئی بٹیروں کو شکرے کی طرح ہاتھ پر بٹھائے ہوئے بھی پھرتے تھے۔ دوسرے جانور پالنے کا شوق مجھے نہیں ہوا۔ اب مجھے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ پرندوں اور جانوروں کو ضرور پالنا چاہیے۔ اس سے انسان کے دل میں جانوروں کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے اور یہی جذبات انسان میں محبت کے احساسات پیدا کرتے ہیں۔

دعوتوں میں کھانا فرش پر بیٹھ کر دسترخوان پر کھایا جاتا تھا۔ ان موقعوں کے لئے مٹی کے ڈھوبریاں تیار کرائی جاتی تھیں جن میں ہر شخص کو علیحدہ سے سالن دیا جاتا تھا۔

استعمال کے بعد ان ڈھوبریوں کو پھینک دیا جاتا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی ان ڈھوبریوں میں کھانے کا ایک عجیب ذائقہ تھا۔ خصوصیات سے جب کھیر ان میں جم کر ٹھنڈی ہوتی تھی تو تازہ مٹی کی خوشبو اس میں بس جایا کرتی تھی۔ پانی پینے کے لئے بھی مٹی کے آب خورے ہوتے تھے۔ اس طرح برتن دھونے کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ استعمال شدہ مٹی کے ان برتنوں کو بعد میں پھینک دیا جاتا تھا۔

مجھے بچپن کے دنوں میں ایک شادی یاد آتی ہے۔ یہ میرے والد کے ایک ہندو دوست کی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے ہم لوگ چاکسو گئے۔ چونکہ اس شادی میں ہم مسلمان مہمان تھے اس لئے ہمارا خاص طور سے خیال رکھا گیا۔ چاکسو میں ہمارا قیام ایک مندر میں ہوا برات کو کھانا درختوں کے سایہ میں دیا جاتا تھا۔ کھانے کے لئے پتوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اکثر یہ کھانا مٹھائیوں کا ہوتا تھا۔ مگر ساتھ میں پوریاں اور اچار بھی شامل ہوتا تھا۔

پلاؤ، بریانی اور متنجن صرف دعوتوں کے موقع پر پکائے جاتے تھے ورنہ عام طور پر گھروں میں گیہوں، جو اور جوار کی روٹی پکتی تھی۔

ناشتہ کا رواج نہیں تھا۔ میرے والد صبح نو یا شاید دس بجے کھانا کھا کر دفتر جاتے تھے اور عصر کو پانچ یا چھ بجے گھر واپس آکر مغرب کے وقت شام کا کھانا کھاتے تھے۔ جب میں مدرسہ جاتا تو گرمیوں میں ستوؤں کا ایک گلاس پی کر یا رات کا بچا ہوا کھانا کھا کر جاتا تھا۔ چائے بہت کم پی جاتی تھی اور وہ بھی سخت سردیوں میں خاص فرمائش پر۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ گرمیوں اور سردیوں میں کیا کھایا جائے۔ مثلاً سردیوں میں تل کے لڈو بنائے جاتے تھے اور گڑ کو گرم گھی میں ڈال کر روٹی سے کھایا جاتا تھا۔ گنے کے رس کی کھیر رات کو پکا کر رکھ دی جاتی تھی اور صبح اٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی کھائی جاتی تھی۔ سردیوں میں اور خاص طور سے چھٹی کے دن ہم بھڑبھونجے کے ہاں سے گرم گرم چنے جیبوں میں بھر لاتے تھے۔ انہیں یا تو ویسے ہی کھاتے تھے یا اگر موقع مل جاتا تو گڑ کے ساتھ ملا کر کھاتے۔ جب چنے بھن رہے ہوتے تھے تو ان کی خوشبو سے

پورا بازار مہک جاتا تھا۔

بازار میں کھانا پینا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے ہر چیز گھر لا کر کھائی جاتی تھی۔ اس وقت شہر میں ایک یا دو ہوٹل ہوں گے۔ مگر ہوٹل میں بیٹھنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بھٹھیاروں کی دکانیں جگہ جگہ تھیں جہاں ہو لوگ کھانا کھاتے تھے جو مسافر ہوں' یا جن کا گھربار نہ ہو۔ بچپن میں' میں نہ تو کبھی کسی ہوٹل میں بیٹھا نہ ہی چائے پی اور نہ ہی باہر کھانا کھایا۔ اگر بچے ان اصولوں اور روایات کی خلاف ورزی کرتے تو شہر کے ہر بزرگ کا یہ فرض تھا کہ وہ انہیں روکے یا ان کی شکایت کرے۔

ادب آداب میں یہ تھا کہ بزرگوں کے سامنے خاموش رہا جائے۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور نصیحتوں کو سنا جائے اور کوئی جواب نہیں دیا جائے۔ اس ماحول میں بچوں کے لئے کوئی احترام اور عزت نہیں تھی۔ ہر بڑا شخص یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انہیں ڈانٹتا رہے اور ان پر حکم چلاتا رہے۔ مدرسوں میں یہ تاثر تھا کہ بچے صرف سزا کے خوف سے پڑھتے ہیں۔ اس لئے سخت سزاؤں کا رواج تھا۔ استاد ایک خونخوار درندے کی طرح ہوتا تھا جو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا اس لئے بچے مدرسہ جاتے ہوئے لرزتے رہتے تھے۔ اکثر بچوں کو مدرسہ سے بھاگنے کی عادت ہو جاتی تھی اور اتنے ڈھیٹ ہو جاتے تھے کہ وہ پھر کسی سزا سے نہیں ڈرتے تھے اور بطور مزاحمت پڑھنا چھوڑ دیتے تھے۔ بچوں کی طرف سے یہ ضد تھی کہ اگر مارو گے تو ہم بھی نہیں پڑھیں گے۔ اس ضد اور سزا کے تصادم میں کئی ہونہار بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ٹونک میں کوئی بینک نہیں تھا کہ جہاں لوگ اپنا پیسہ رکھتے اس لئے روپیہ پیسہ گھروں میں چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ میں تو زمین دفن کرنے کا بھی رواج تھا تاکہ لوٹ مار سے محفوظ رہے۔ ریاست ٹونک کی اپنی کرنسی تھی۔ روپیہ کی بڑی قدر تھی۔ پیسوں کے حساب سے چیزیں خریدی جاتی تھیں۔ اکثر کوڑیاں بھی بطور کرنسی استعمال ہوتی تھیں۔ بازار میں صرافوں کی دکانیں تھیں جہاں سفید چاندنی پر روپیہ

و پیسوں کی ڈھیریاں لگی ہوتی تھیں۔ ان ڈھیریوں کے پیچھے سفید براق کپڑے پہنے اور توند نکالے ساہوکار یا سیٹھ صاحب بیٹھے ہوتے تھے۔ روپیہ تڑوانا ہو یا ریزگاری کو روپیہ میں بدلوانا ہو تو انہیں کے پاس جایا جاتا تھا۔ یہ لوگ سود پر بھی قرضہ دیا کرتے تھے۔ اس وقت چور ڈاکو ان ڈھیریوں کو سمیٹ کر نہیں لے جاتے تھے۔

چوری کی وارداتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ گھروں کے دروازے رات گئے تک کھلے رہتے تھے۔ دکانیں بھی معمولی کواڑوں سے بند کر دی جاتی تھیں۔ قتل کی واردات بھی شاذونادر ہوتی تھی۔ لڑائیوں میں کبھی کبھی چاقو یا چھری کا استعمال ہو جاتا تھا' ورنہ ہاتھاپائی پر بات ختم ہو جاتی تھی۔ لڑائی جھگڑے کے بارے میں ایک مرتبہ ہماری دادی نے کہا کہ ان کی نند سنبھل سے آئیں۔ اتفاق سے محلہ میں جھگڑا ہو گیا' شوروغل کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو پریشان ہو گئیں۔ جب مرد گھر میں آئے تو پوچھنے لگیں کہ کتنے زخمی ہوئے اور کیا کوئی قتل بھی ہوا؟ جب انہیں بتایا گیا کہ جھگڑا صرف شوروغل اور باتوں پر ختم ہو گیا تو انہیں انتہائی مایوسی ہوئی اور کہنے لگیں کہ "ٹونک کے پٹھانوں کو کیا ہو گیا' صرف باتوں سے لڑتے ہیں' ہمارے سنبھل میں جھگڑا ہو تو جب تک دو چار زخمی نہ ہوں اس وقت تک بات ختم نہیں ہوتی ہے۔"

ٹونک کا معاشرہ اور دوسرے علاقوں کی طرح' مردوں کا معاشرہ تھا۔ یہاں باہر عورتیں نظر نہیں آتی تھیں۔ سوائے ہندو عورتوں کے۔ ان کی تفریح کا واحد طریقہ خاندانی تقریبات تھیں۔ شادیوں کی تقریبات مہینوں چلتی تھیں ایسے موقعوں پر مہمان دور و نزدیک سے آ کر جمع ہو جاتے تھے۔ شادی والے دن جو مہمان خاندان گاڑیوں میں آتے تو ان کا کرایہ صاحب خانہ دیا کرتا تھا۔

عورتوں کی ایک تفریح یہ تھی کہ کبھی کبھار پکنک پر جسے "گوٹ" کہتے تھے' جایا کرتی تھیں۔ گوٹ کے لئے مناسب مقام یا تو بناس کی ندی ہوتی تھی یا نوگزے صاحب کی قبر کے قریب کا علاقہ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم نوگزے صاحب کی قبر پر گئے۔ یہ قبر واقعی بڑی لمبی تھی۔ اس پر چادر پڑی ہوئی تھی اور اگربتیوں کی خوشبو چاروں

طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں قریب ہی ندی بہتی تھی، جس کا پانی پہاڑوں سے آتا تھا اور اس قدر صاف و شفاف تھا اس میں تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف نظر آتی تھیں۔

میری والدہ اپنی بہنوں سے ملنے کے لئے کبھی کبھار ٹونک سے باہر جایا کرتی تھیں۔ ان کی ایک بہن انیارے میں رہتی تھیں، جو ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ دوسری کھاتولی میں، جہاں پٹھان جا کر آباد ہو گئے تھے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جب تک گاڑی شہر میں ہوتی تو پردے پڑے رہتے تھے۔ شہر سے نکل کر جیسے ہی ویرانے میں آتے تو پردے اٹھا دیئے جاتے تھے۔ بیل گاڑی کچے راستے پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاتی تھی۔ سفر اکثر رات کے وقت پر کیا جاتا تھا۔ چاندنی رات میں جب ہر طرف خاموشی ہوتی تو یہ سفر بڑا دلکش ہو جاتا تھا۔

راستے کے دونوں جانب جب ہرے بھرے کھیت آتے تو سماں اور خوبصورت ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہم گاڑی سے اتر کر چنے کے کھیتوں سے بالیاں توڑتے تھے اور پھر دوڑتے گاڑی میں سوار ہو جاتے تھے۔ ان چنوں کو بوٹ کہتے تھے جب انہیں آگ میں بھون کر کھایا جاتا تھا تو یہ ہولے کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ راستے میں جھاڑیوں سے بیر توڑ کر انہیں جیبوں میں بھر لیتے تھے۔

انیارہ چھوٹی سی جگہ تھی چونکہ یہاں کا راجہ ہندو تھا اس لئے شکار کرنا سخت منع تھا۔ یہاں پر مور بڑی تعداد میں تھے۔ شہر میں اور شہر سے باہر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ جہاں موروں، کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے غول نظر آتے تھے۔ اکثر مور مست ہو کر ناچتے رہتے تھے اور شہر ان کی آوازوں سے گونجتا رہتا تھا۔ یہاں ہندو اور مسلمان سب ایک ہی رنگ میں نظر آتے تھے۔ یہاں سے ہم آگے چل کر کھاتولی جاتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ پٹھانوں کی آبادی نے یہاں تلوار چھوڑ کر ہل سنبھال لیا تھا۔ کھیتوں کے درمیان، کچے، پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ گھروں میں گائیں و بھینسیں تھیں۔ مرد شام کو چبوتروں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ یہاں عورتوں کو قدرے آزادی تھی، وہ ایک گھر سے دوسرے گھر بغیر کسی

پردے کے چلی جایا کرتی تھیں۔

والد کے ساتھ میں منڈاور جایا کرتا تھا۔ یہاں والد ریاست کی جانب سے لگان وصول کرنے جاتے تھے۔ جس مکان میں ہم ٹھہرا کرتے تھے یہ اونچائی پر بنا ہوا تھا۔ وہ اس کی ڈیوڑھی میں فرش پر بیٹھ جاتے تھے اور کسان انہیں نقد روپیہ جمع کراتے رہتے تھے۔ جن کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ چونکہ یہ مکان سرکاری تھا' اس لئے یہاں مختلف اوقات میں مختلف لوگ آ کر ٹھہرتے تھے اور بطور یادگار دیوارں پر اپنے نام اور اقوال لکھ جاتا تھے۔ میں نے بھی ایک دیوار پر اپنا نام لکھا تھا۔ شاید یہ اب تک باقی ہو یا زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکا ہو۔

میں جب گھر سے باہر گھومنے جاتا تو کھیتوں میں کبوتروں اور فاختاؤں کے غول کے غول نظر آتے تھے۔ اگرچہ میں غلیل رکھتا تھا مگر مجھ سے کبھی کوئی پرندہ شکار نہیں ہوا۔ شام کو جب گاؤں والے ملنے آتے تو سب والد کے پلنگ کے گرد زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔ میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھ کر تاش کھیلا کرتا تھا۔ گاؤں میں ہماری من پسند غذا اڑد یا ماش کی دال ہوتی تھی۔ میرے والد کی یہ پسندیدہ غذا تھی۔ اور اسے کئی طرح سے پکواتے تھے۔ مسالہ کی' بغیر مسالہ کی' میتھی والی وغیرہ' اس میں گھی ڈال کر بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

والد کو شکار کا بھی بڑا شوق تھا۔ شکار میں ہرن اور تیتر مار کر لاتے تھے۔ اگر شکار زیادہ آ جاتا تو فورا" اسے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اگر اس وقت تک ریفریجریٹر آ گیا ہوتا تو پھر یہ فیاضی نہیں ہوتی اور آجکل قربانی کے گوشت کی طرح اسے بھی محفوظ کر لیا جاتا۔ فیاضی و سخاوت کا تعلق بھی حالات سے ہوتا ہے۔ یہ انسان کو فیاضی پر بھی آمادہ کرتے ہیں اور اسے کنجوس بھی بناتے ہیں۔

ٹونک ایک ریاست کی حیثیت سے رہا۔ یہاں پر امیر خاں کے خاندان کے لوگ نواب بنتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی توانائی اور طاقت کو بھی کھوتے رہے۔ نواب کے خاندان کے مرد حضرات صاحبزادے کہلاتے تھے۔ یہ لفظ بھی اپنے اصلی معنی

کھو چکا تھا اور اب اس سے ناکارہ' نکمے اور عیاش مراد لی جاتی تھی۔ معاشرہ میں ان صاحبزادوں کی کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ ان کا گزارہ اپنی جائیدادوں کی آمدن پر ہوتا تھا جو کم ہو کر بڑھتے ہوئے خاندانوں کے لئے ناکافی ہو رہی تھی۔ اس لئے ان کی حویلیاں' ان ہی کی طرح اندر اور باہر سے خستہ اور بوسیدہ ہو کر آسیب زدہ ہو گئیں تھیں۔ حالات کی تبدیلی نے ان صاحبزادوں کو اس طرح سے اپنے بہاؤ میں لیا کہ یہ اس کے دھارے میں گم ہو گئے۔ تاریخ سے یہ سبق کم ہی لوگوں نے سیکھا ہوگا کہ جو مراعات ایک مرتبہ مل جاتی ہیں' ان سے چپک کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے' بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات سے موافقت پیدا کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں نے خود کو بدلتے حالات کے لئے تیار نہیں کیا تھا اس لئے جب انکی ریاستیں ختم ہوئیں اور پھر ان کے وظیفے بند ہوئے تو ان لوگوں کے لئے جینا دوبھر ہو گیا۔ ان میں کچھ نے تو اپنی بچی کھچی جائیداد اور سرمایہ سے خود کو بچائے رکھا' مگر چھوٹی ریاستوں کے والیان اور ان کے خاندان اپنی شناخت کھو کر عوام میں مل چکے ہیں۔

اس وقت جب کہ میں یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں' ٹونک کو چھوڑے ہوئے اڑتالیس سال گزر چکے ہیں مگر میرے ذہن میں ابھی تک 1952ء کا ٹونک زندہ و تازہ محفوظ ہے۔ آج بھی رات کو جب میں آنکھیں بند کرکے لیٹتا ہوں تو شہر کا پورا نقشہ ذہن میں آ جاتا ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں یہ شہر آج بھی اسی حالت میں اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس کے بازار' گلیاں' سڑکیں' راستے' دکانیں اور لوگ سب اسی طرح سے موجود ہیں۔ شاید زمانہ بالکل آگے نہیں بڑھا ہے۔ میں ہر روز آنکھیں بند کرکے محسوس کرتا ہوں کہ میں گھر سے نکلا ہوں۔ راستے میں گلی کے نکڑ پر وہ شخص نظر آتا ہے جو پاگل ہو گیا ہے۔ وہ لمبا سا ڈنڈا پکڑے گلی کے ایک جانب چپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔ نہ کسی سے بولنا' نہ کچھ کہنا۔ جب ایک طرف سے کھڑے کھڑے تھک جاتا ہے تو دوسری جانب چلا جاتا ہے۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے' اس

لئے میں اس کے سامنے سے جلدی جلدی گزرتا ہوں، وہ آنکھیں اٹھا کر مجھے خاموشی سے جاتا دیکھتا ہے اس کے پاس سے گزر کر میں کچہری سے ہوتا ہوا سڑک پر آتا ہوں جو سیدھی محلّہ قافلہ سے ہوتی ہوئی گھنٹہ گھر تک جاتی ہے۔

میرے ذہن میں وہ راستہ بھی اسی طرح سے محفوظ ہے جو ہمارے گھر سے رجبن جاتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ جب آنکھیں کھولتا ہوں تو خود کو ان یادوں سے بہت دور پاتا ہوں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک بار ٹونک ضرور جاؤں، مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر میں گھر گیا اور وہاں اماں کو باورچی خانہ میں روٹی پکاتے، والد کو پلنگ پر لیٹے کتاب پڑھتے، دادا کو ہاتھ میں ڈنڈا لئے خاموشی سے ٹہلتے اور دادی کو کپڑے سیتا نہ پایا اور نانی کے گھر نانی کو مرثیہ پڑھتے و زاروقطار روتے اور ماموں کو اپنی سائیکل کی صفائی کرتے نہ پایا تو پھر میرے دل میں اٹڈتے جذبات اور بہتے آنسوؤں کو کون روکے گا۔

☆

حیدر آباد سندھ

نوائی سے چل کر ہماری ٹرین موناباؤ پر آ کر ٹھہری۔ یہاں سامان اتارا گیا۔ اس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی، سخت گرمی تھی، مسافروں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ یہاں ہندوستان و پاکستان کی سرحدوں کے درمیان علاقہ غیر تھا، اس لئے مسافروں کو پیدل چل کر کھوکھراپار جانا تھا۔ میری دادی چونکہ ضعیف تھیں اس لئے وہ اس قابل نہیں تھیں کہ اتنا فاصلہ پیدل چل کر طے کر سکیں۔ اس لئے ان کے لئے یہ بندوبست کیا گیا کہ انہیں پلنگ پر بٹھا کر چار قلیوں نے اٹھایا۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے کہ جب عورتوں، بچوں اور مردوں کے ہجوم میں، دھوپ اور گرمی میں یہ لوگ، ایک سرحد سے دوسری سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ اس ہجوم کے بیچ میں میری دادی پلنگ پر بیٹھی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اپنے طریقہ سفر کی وجہ سے وہ جلد مسافروں میں مقبول ہو گئیں اور ان کی وجہ سے لوگ ہمیں بھی جاننے لگے۔ میری والدہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں پیدل چلیں۔ حالات کس طرح روایات کو توڑتے ہیں اور وہ قدریں کہ خاص حالات میں بڑی عزیز ہوتی ہیں، کس طرح وقت کے ہاتھوں پامال ہوتی ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ پردہ کی سخت پابندی اور اب کسی کو پردے کے احترام کی پروا نہیں۔ کہاں وہ زمانہ کہ کسی غیر مرد کی عورت پر نظر نہ پڑے یا اب سب شانہ بشانہ ہجوم میں شامل چلے جا رہے ہیں۔

تقسیم کا ایک اثر جو ہوا وہ یہ کہ اس نے روائتی اور مستحکم شدہ روایات اور قدروں کو توڑ دیا۔ وہ لوگ بھی جو اپنی خاندانی شرافت و عظمت کے خول میں بند اپنی

دنیا کو برقرار رکھے ہوئے تھے اور وہ سب ہجوم میں شامل تھے۔ یہ سب لوگ اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ ان کی خاندانی یادیں اور وہ میوزیم جن میں انہوں نے اپنے بزرگوں کی تلواروں کو سنبھال کر رکھ رکھا تھا' اب یہ سب باتیں قصہ پارینہ ہو گئیں تھیں۔ اس وقت سب عام لوگ تھے جو ایک جگہ سے اپنا رشتہ توڑ کر دوسری جگہ اپنی جڑیں جمانا چاہتے تھے۔ شاید ان میں سے ہر ایک نئی سرزمین پر روشن مستقبل دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک یقینی کیفیت سے غیر یقینی صورتحال کو خوشی خوشی تسلیم کرنے پر تیار تھے۔

اس وقت تک یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ ہم کیوں اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں کہ جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ میں اس ہجوم میں شامل ضرور تھا مگر اپنی مرضی سے نہیں' حالات کے دباؤ سے۔ ایک بار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' لوگوں کی قطار میں' والدہ آہستہ آہستہ ہانپتی چلی آ رہیں تھیں۔

کھوکھراپار پہنچ کر چادریں تان کر خیمے بنائے گئے۔ خیمے کیا چھولداری کہیے۔ یہاں ہمیں دو یا تین دن انتظار کرنا تھا کیونکہ ٹرین ہفتہ میں ایک یا دو بار آتی تھی۔ جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ یہ ایک ریتیلا میدان تھا۔ یہاں ایک طرف پولیس والوں کے چند کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑا ہوٹل تھا جو مسافروں کو کھانا مہیا کرتا تھا۔ یہ سارا منظر بڑا دلخراش تھا۔ میں نے سوچا' یا خدا کیا یہ پاکستان ہے؟ اور کیا اس جیسے ماحول میں ہمیں رہنا ہوگا؟ شاید دو دن ہم اس ریگستان میں ٹھہرے۔ ایک دن شام کو کچھ بچوں کے ساتھ ہم پولیس کے کوارٹروں کے قریب کھیل رہے تھے۔ کھیل میں شور بھی ہو رہا تھا کہ اچانک ایک پولیس والا آیا' اور اس نے ہم سب کو ایک بڑی سی گالی دی اور بھاگ جانے کو کہا۔ گالی سن کر میں تھوڑی دیر کے لئے ششدر رہ گیا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے نہ تو اس طرح سے ڈانٹا تھا اور نہ گالی دی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میرے دل میں کسی تابناک مستقبل کی امید نہ تھی اور نہ ہی آگے کی زندگی کے بارے میں سوچا۔ اس گالی اور پولیس والے کے رویہ نے اداس کر دیا۔ میں خاموشی سے آ کے چھولداری میں لیٹ گیا۔

جس دن ٹرین کو آنا تھا اس دن تمام سامان باندھ کر رکھ لیا گیا۔ جب ٹرین آئی تو

ہم نے دیکھا کہ یہ مال گاڑی تھی۔ اس میں ڈبوں میں بیٹھنے کی کوئی سیٹیں نہیں تھیں۔ لہٰذا سامان کو ڈبے میں پھینکا گیا' پھر ہمیں سوار کرایا گیا' اب ہم مسافر نہیں مویشی یا سامان تھے کہ جو مال گاڑی کے ڈبوں میں ٹھنسے ہوئے سفر کر رہے تھے۔ جب ٹرین چلی اور میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو کیمپ کی جگہ ویران ہو چکی تھی۔ ہوٹل اور پولیس کوارٹرز اب ویرانہ میں تنہا و اداس کھڑے نظر آ رہے تھے۔ یہ جگہ اس طرح آباد ویران ہوتی رہتی تھی مسافر آتے رہتے تھے' مال گاڑی انہیں ایک سرحد سے دوسری سرحد میں منتقل کرتی رہتی تھی۔ کھوکھراپار کا یہ راستہ رستا ناسور (یہ پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا کے الفاظ ہیں) اس طرح سے کئی سالوں اور رستا رہا' یہاں تک کہ اس زخم کو مرہم پٹی کرکے بند کر دیا گیا۔

مغرب کے وقت ہماری مال گاڑی میرپور خاص پہنچی۔ یہاں ہم نے میرپور خاص کے سٹیشن اور اس کی چہل پہل دیکھی۔ اس کے بعد اگلا سٹیشن حیدر آباد کا تھا کہ جو ہماری منزل تھی۔ جب یہاں ہم پہنچے تو بڑے چچا کے گھر سے ہمیں کوئی لینے آیا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ہم نے تانگوں میں سامان رکھا اور پھر ہیرا آباد چچا کے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

چچا کا گھر صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ اس وقت یہاں دو خاندان رہتے تھے۔ یعنی چچا اور ان کے گھر والے اور چچی اور ان کے بھائی کا خاندان۔ چارپائیاں شاید دو یا تین ہوں۔ باقی سب لوگ فرش پر سوتے تھے۔ گھر کیا تھا' ایک مسافر خانہ تھا' میرے چھوٹے چچا بھی ہیرا آباد میں رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک کمرے کا گھر تھا۔ یہ گڑبڑ اس لئے ہوئی تھی کہ تقسیم کے بعد ایک ہی گھر کو کئی حصوں میں بانٹ کر مختلف خاندانوں کو الاٹ کر دیا گیا تھا۔ زنانہ کسی کے حصہ میں آیا تو مردانہ کسی اور ہی خاندان کو ملا۔ نیچے کے حصہ میں کوئی اور ہے تو اوپر والا حصہ کسی اور آنے والے کو مل گیا۔ ابتدا میں تو لوگوں کو سر چھپانے کی ضرورت تھی۔ اس لئے جو مل گیا تھا اس پر خوش تھے۔ مگر بعد میں اس تقسیم کی وجہ سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ جو اب تک چلے آ رہے ہیں۔

ہیرا آباد کے گھر خوبصورت تھے۔ فرش پر رنگیں ٹائلز' دیواروں اور چھتوں پر نقش و نگار اور کھڑکیاں اور دروازے آرٹ کا نمونہ' مگر جب ایک گھر کئی حصوں میں بٹ گیا تو اس کی خوبصورتی اور افادیت کم ہو گئی۔ کچھ گھروں میں باہر کی جانب تہہ خانے تھے۔ کئی خاندان ان تہہ خانوں میں آباد ہو گئے۔ گلی کے ایک حصہ کو اس میں شامل کر کے ٹاٹ کا پردہ ڈال کر انہوں نے اپنی رہائش بنا لیا جو بااثر اور پیسہ والے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا مگر غریب تو ہر جگہ غریب ہی ہوتا ہے' اس کے حصہ میں زمین بھی کم ہی آتی ہے۔

یہاں ہم دو یا تین مہینہ رہے۔ اس کے بعد ہم رشتہ کی نانی جنہیں سعادت خالہ کہتے تھے' ان کے گھر میں چلے گئے۔ یہ گھر بھی ہیرا آباد میں پیپل کے درخت کے پاس تھا اور برابر والے مکان کا مردانہ تھا۔ اس لئے اس میں صرف ایک چھوٹا کمرہ تھا چونکہ وہ خود کراچی میں تھیں اس لئے انہوں نے وقتی طور پر یہ ہمیں دے دیا۔

پاکستان آنے سے پہلے والد نے اپنی جمع شدہ پونجی بھجوا دی تھی اور اپنے بھائی سے کہا تھا کہ وہ ان کے لئے کوئی مکان خرید لیں لیکن کوئی مکان نہیں خریدا گیا۔ آنے کے بعد بڑے چچا نے ایک کچا مکان محلہ کالی موری میں دلوا دیا۔ یہ اس وقت کی کچی آبادی تھی۔ یہ ایک کمرے کا مکان تھا کہ جس میں نہ بجلی تھی اور نہ پانی پتہ نہیں میرے چچا کو یہ جگہ ہمارے لئے کیوں پسند آئی؟ جب کہ اس وقت پگڑی پر سستے مکان مل رہے تھے۔ اس گھر کو دیکھ کر سب سے زیادہ صدمہ میری والدہ کو ہوا مگر انہیں یہ تسلی دی گئی کہ جلد ہی دوسرا مکان لے لیں گے۔ دوسرا مکان لینے میں تیرہ سال لگے۔

1952ء کا حیدر آباد صاف ستھرا اور خوبصورت شہر تھا۔ شہر میں سواری کے لئے تانگے تھے۔ جگہ جگہ تانگہ سٹینڈ بنے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے پانی پینے کے لئے بھی کئی جگہیں تھیں۔ ایک بس تھی جو ہیرا آباد سے سٹیشن تک چلا کرتی تھی۔ کاریں شاید دو یا چار ہوں۔ زیادہ تر لوگ پیدل چلا کرتے تھے۔ سڑکوں کی صفائی صبح صبح پابندی سے ہوتی تھی۔ نالیاں صبح و شام دھلا کرتی تھیں۔ شہر میں کئی خوبصورت باغ تھے۔ سٹیشن کے پاس دو بڑے باغ' اب اس جگہ ہوٹل اور دکانیں ہیں۔ ایک اور باغ کی جگہ اب

جوتوں کی مارکیٹ ہے۔ گورنمنٹ ہائی سکول کے سامنے جو باغیچہ تھا، وہاں اب گول بلڈنگ ہے۔ ہسپتال کے پاس سرفراز پارک میں، میونسپلٹی کی عمارت بن گئی ہے۔ پریم پارک جو کینٹ میں تھی، وہاں فوج نے فلیٹس بنوا لئے ہیں۔ پھلیلی، جس کے کنارے گورنمنٹ کالج ہے وہاں دلشاد باغ میں اب خوجہ کالونی ہے۔ اس نہر کے کنارے کنارے ایک بڑا شاندار باغ تھا۔ وہ بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے آخری کونے پر دھولنداس باغ تھا اس باغ کے بھی نشانات مٹ گئے۔ اب حیدر آباد مارکیٹوں اور فلیٹوں کا شہر ہے۔

ہیرا آباد کے ساتھ عامل کالونی ہے، عامل سندھی ہندو تھے جو سرکاری ملازم ہوتے تھے، بعد میں یہ تجارت بھی کرنے لگے تھے۔ ان کے گھر بڑے اور کشادہ تھے۔ یہ گھر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ چونکہ ہیرا آباد عامل کالونی میں ایک بڑی تعداد قصائیوں کی آ کر آباد ہوئی، اس لئے ہر طرف بھینسوں کی بھرمار تھی۔ پھلیلی کی نہر میں ہمیشہ بھینسیں نہاتی رہتی تھیں۔ اس وجہ سے اس کا پانی گندا ہو کر کالا ہو گیا تھا۔

شہر میں چھوٹی چھوٹی کئی لائبریریاں تھیں مگر یہ بھی ایک ایک کرکے ایسے ختم ہوئیں کہ اب ان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ شہر میں دو مشہور ہال تھے۔ تھیوسو فیکل سوسائٹی کا اینی بیسنٹ ہال اور ہوم اسٹیڈ ہال۔ ہوم اسٹیڈ ہال میں شروع میں تو ریڈیو پاکستان کا سٹیشن قائم ہوا۔ اب یہاں میونسپلٹی کا آفس ہے۔ اس کے ایک لان میں مسجد بنا دی گئی ہے۔ دوسرا لان اجڑ گیا ہے۔ بیسنٹ ہال ایک عرصہ تک ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا مگر اس کے جو انچارج تھے انہوں نے آہستہ آہستہ اس کی لائبریری کو ختم کیا، اب اس میں جوڈو کراٹے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

حیدر آباد میں اس وقت ایرانیوں کے کئی ہوٹل تھے۔ ان میں کیفے اے ون کیفے یونٹی، کیفے آستان، کیفے راکسی، دربار ہوٹل، ہوٹل شیزان اور کیفے جارج قابل ذکر تھے۔ یہ صاف ستھرے اور سستے ہوٹل تھے۔ اس لئے طالب علموں اور متوسط طبقے کے لئے یہ سماجی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے۔ عرصہ دراز تک ہماری نشستیں ان ہوٹلوں میں

رہیں۔ سب سے آخر میں ہم کیفے لکی میں بیٹھتے تھے جو ہیرا آباد پوسٹ آفس کے قریب ہے۔ شام ہوتے ہی یار دوست شہر کے کونے کونے سے یہاں اکٹھے ہو جاتے تھے اور خوب زور سے گپ شپ رہتی تھی۔

فردوس سینما کے اوپر جو کنٹین تھی وہ ایک زمانہ میں یونیورسٹی کے طالب علموں کا ٹھکانہ بن گئی تھی۔ ان میں سے اکثر وہ طلبہ تھے جو سی ایس ایس کی تیاری میں مصروف تھے اور خود کو ابھی سے افسر سمجھنے لگے تھے۔ بعد میں حقیقت میں ان میں سے کچھ افسر ہو بھی گئے۔ یہاں ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ چائے کا بل کوئی اور ادا کرے۔ بابو' جو یہاں کا ویٹر تھا وہ پہچان چکا تھا کہ کون بل دینے والا ہے اور کون مفت خور۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی کے ایک طالب علم صولت کے پاس نہ جانے کہاں سے اتنے پیسے آئے کہ راتوں رات دولت مند ہو گئے۔ اس راز سے پردہ آج تک نہیں اٹھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ یونیورسٹی تانگے میں آتے تھے اور تانگہ ان کے انتظار میں باہر کھڑا رہتا تھا۔ جلد ہی وہ مفت خوروں کے سرپرست بن گئے۔ انہیں چائے پلانا' کھانا کھلانا اور سینما دکھانا ان کے ذمہ ہو گیا لیکن جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ مفت خورے ان کا کھاتے بھی ہیں اور مذاق بھی اڑاتے ہیں' تو ایک دن انہوں نے یہ کیا کہ انہیں سب کو انڈس ہوٹل لے گئے۔ انہیں خوب کھلایا پلایا اور پھر خود کسی بہانے سے وہاں سے غائب ہو گئے۔ سنا ہے کہ مفت خوروں کو بڑی مشکل سے رقم جمع کرکے بل ادا کرنا پڑا۔

سلطان ہوٹل اس وقت شاعروں' ادیبوں اور فلمی دنیا سے دلچسپی لینے والوں کا مرکز تھا۔ یہ ہوٹل اب بھی گاڑی کھاتہ میں واقع ہے۔ مگر اب اس کی پرانی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کے نچلے حصہ میں سستا کھانا اور چائے ملتی تھی جبکہ اوپر والا حصہ مہنگا تھا۔ اوپر والے حصے میں شام ہوتے ہوتے شہر کے ادیب و شاعر اور صحافی جمع ہو جاتے تھے۔ یہاں بیٹھنے کے لئے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ہر کیبن میں وہاں بیٹھنے والوں کے احساس جمال کی تسکین کے لئے تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ کسی میں ٹارزن شیر سے مقابلہ کرتا دکھائی دیتا تھا' کسی میں ہاتھی پر سوار صاحب بہادر شیر کا شکار کر رہے ہیں۔ دیواروں کی یہ تصویریں اور ان کے منظر بدلتے رہتے تھے۔ جب بھی سال یا دو

سال بعد نیا پینٹ ہوتا تو پینٹر نئی تصویریں پینٹ کر دیتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے یہاں مستقل بیٹھنے والے یکسانیت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔

ہوٹل میں جگہ جگہ لکھا ہوا تھا کہ "یہاں سیاست پر بات کرنا منع ہے" اس کے نیچے لوگ زور و شور سے حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے تھے۔ کسی نے بھی اس ہدایت کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔ نہ ہی ہوٹل کے مالک نے گفتگو کو سن کر لوگوں کو سیاست سے باز رہنے کو کہا۔

جب اختر انصاری اکبر آبادی حیدر آباد آئے اور انہوں نے اپنے رسالہ "نئی قدریں" یہاں سے نکالنا شروع کیا تو ایک عرصہ تک سلطان ہوٹل میں ان کا آفس ہوا کرتا تھا۔ بعد میں جب وہ غزنوی ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے تو ان کا کھانا پینا گاڑی کھاتہ کے ہوٹلوں میں ہوا کرتا تھا۔ بقول ہمارے ایک دوست کے "گاڑی کھاتہ ان کا ڈائننگ ہال تھا۔" لیکن سب سے مقبول جگہ یونیورسٹی کی کنٹین تھی جہاں ایک چائے میں دو یا تین کپ بنائے جاتے تھے۔ یہاں صبح سے شام تک طالب علموں کا مجمع لگا رہتا تھا۔

میں جب تک طالب علم رہا' پیسوں کا مسئلہ رہا۔ اس لئے کنٹین یا ہوٹل میں چائے پینے سے پہلے جیب کو دیکھا جاتا تھا۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اس کے منتظر ہوتے تھے کہ جہاں کوئی جاننے والا نظر آئے' اس کے پاس جا کر اسلام علیکم کہا اور چائے پینے بیٹھ گئے۔

جب حیدر آباد میں ہوٹل اورینٹ کھلا تو ہوٹل میں بیٹھنے والوں کو ایک اور اچھی جگہ مل گئی۔ یہ ایئرکنڈیشن ہوٹل تھا اس لئے اس وقت حیدر آباد والوں کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ بعد میں فاران نامی دوسرا ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل کھل گیا تو نشستیں دونوں جگہ ہونے لگیں۔ لیکن حیدر آباد کا پرانا اور روائتی ہوٹل رٹز تھا۔ یہاں چائے پینے نہیں بلکہ اس کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے تھے۔ اس کا ہال ہوٹل کے بجائے گھر کا ڈرائنگ روم لگتا تھا۔ ہم یہاں آکر بیٹھ جاتے تھے اور گھنٹوں کوئی چائے کا آرڈر لینے نہیں آتا تھا۔ آخر خود جا کر آرڈر دے دیں تو چائے کے آنے میں ایک

طویل وقفہ ہوتا تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا لان ہوا کرتا تھا' جہاں کو آرام کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ شام کو حیدر آباد کی ٹھنڈی ہوائیں اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر بات چیت بڑا مزا دیتی تھی۔ اس کے اکثر گاہک مستقل ہوتے تھے۔ محض چائے پینے تو کبھی کبھار کوئی آتا ہوگا۔ اب اس ہوٹل کا نقشہ بدل گیا ہے۔ اس کے لان میں دکانیں بنا دی گئی ہیں اور ہوٹل کے اگلے حصے کو بھی مارکیٹ میں بدل دیا گیا ہے۔ حیدر آباد کی ایک اور نشانی بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

1960ء کے شروع میں جام شورو میں غلام محمد بیراج جو کہ اب کوٹری بیراج کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں المنظر نام کا ہوٹل کھلا تو اس کی شہرت پورے شہر میں ہو گئی۔ لوگ تو وہاں جانا چاہتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ جن کی اپنی سواری نہیں تھی ان کے لئے وہاں جانا مشکل تھا۔ اس وقت تک جام شورو کے لئے صرف ایک بس ہوا کرتی تھی' جس کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں تھا لیکن المنظر میں چائے پینا بھی ضروری تھی لہٰذا ایک دن دوستوں کے ساتھ بس میں سوار ہو کر ہم المنظر چائے پینے چلے گئے۔ لطف بہت آیا' کیونکہ خاموشی میں دریا کا شور اور تیز ٹھنڈی ہوا۔ اس نے بس میں آنے جانے کی مصیبت کو بھلا دیا۔

جب حیدر آباد کے ہوٹلوں کا ذکر چل پڑا تو چھوٹی گٹی میں واقع ہوٹل ڈی پیرس کا ذکر بھی لازمی ہے۔ یہاں اکثر ہم کالج سے واپسی پر چائے پینے بیٹھ جاتے تھے۔ بہت ہی صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ اس کا کچن بھی صفائی کی وجہ سے چمکتا رہتا تھا۔ چائے چالو ہوتی تھی اور گاڑھی بھی۔ نہ جانے اس میں کیا ملاتا تھا کہ اس کا اپنا ذائقہ تھا۔ یہاں پر آنے والے اکثر شاہی بازار کے دکاندار ہوتے تھے۔ جو کرسی پر پاؤں رکھ کر بیٹھتے تھے اور طشتری میں چائے انڈیل کر دو یا تین گھونٹوں میں سڑپ کرکے پی جاتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے چند منٹ میں چائے پی اور پھر باہر۔ اگر گاہک پندرہ بیس منٹ سے زیادہ بیٹھ جائے تو یہ اس کے اوپر والا پنکھا بند کرا دیا جاتا تھا۔

مارکیٹ میں گھنٹہ گھر کے قریب دو ہوٹل تھے۔ جن میں کھانا اور چائے سستی ملتی تھی۔ ان دونوں ہوٹلوں میں مقابلہ کے طور پر زور زور سے فلمی ریکارڈز بجتے رہتے

تھے۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا' ان گانوں کے بول کانوں پڑتے۔ اس لئے میں کچھ گانوں سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اب بھی جب ان کو کہیں سنتا ہوں تو میں فوراً" خود کو ان ہوٹلوں کے سامنے پہنچا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

جب ٹیپ ریکارڈز اور کیسٹس آئے تو چھوٹے چھوٹے ہوٹل کھلنا شروع ہو گئے جہاں ہندوستانی فلموں کے پرانے گانے بجتے رہتے تھے۔ یہاں پر اب لوگ چائے پینے اس لئے آتے تھے تاکہ وہ ان گانوں سے لطف اندوز ہوں۔

ان ہوٹلوں نے حیدر آباد کی ثقافتی اور سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے بڑھی کیونکہ گھر چھوٹے ہوتے تھے اور گھروں میں ڈرائنگ رومز نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے نوجوانوں کی ٹولیاں یا تو مکان کی سیڑھیوں پر یا گلی میں کھڑی ہوتی تھیں اگر جیب میں پیسے ہوتے تو یہ محفلیں ہوٹل میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ اگر مہمان ملنے آ جاتے تو ان کی خاطر تواضع ہوٹل میں ہی لے جا کر کی جاتی تھی۔ ایرانیوں کے ہوٹل اس لئے خوب چلتے تھے کیونکہ یہ متوسط طبقہ کے معیار کے مطابق ہوا کرتے تھے۔

ہوٹل میں بیٹھ کر جو آزادانہ گفتگو ہوتی تھی وہ مکان میں ممکن نہیں تھی۔ ان ہوٹلوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی تھی کہ شہر میں متوسط طبقے کے لئے نہ تو کلب تھے اور نہ تفریح کا کوئی ذریعہ۔ ایسے میں یہ ہوٹل ہی ملنے جلنے اور بات چیت کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ اگر دوست نہ ہوں اور خود تنہا ہو' تب بھی ان ہوٹلوں میں اچھا وقت گزر جاتا تھا۔ خاموشی سے چائے پی اور ہندوستانی فلموں کے اداس گانے سنے اور وقت گزار دیا۔

ان ہوٹلوں کی وجہ سے حیدر آباد کے شاعر' ادیب' فلمی دنیا کے شوقین ان سب کو بیٹھنے کی جگہ ملتی تھی۔ یہیں پر نوجوانوں کے خیالات بنتے تھے۔ ان نشستوں سے زندگی کے تجربات سیکھتے تھے اور یہیں سے ان میں آگے بڑھنے کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ ان ہی ہوٹلوں نے حیدر آباد سے مشہور شاعروں' فلمی اداکاروں' اخبار نویسوں اور بیوروکریسی کے افسران کو پیدا کیا۔

اب حیدر آباد میں ہوٹلوں کا یہ کلچر ختم ہو گیا۔ تمام ایرانی ہوٹل سوائے ایک یا دو کے، بند ہو گئے ہیں۔ اب پتہ نہیں کہ نوجوانوں کی نشستیں کہاں ہوتی ہیں اور شاعر و ادیب و دانشور کہاں ملتے ہیں؟ عام طور سے جب ایک چیز ختم ہوتی ہے تو اس کا نعم البدل ضرور پیدا ہوتا ہے مگر شاید ان ہوٹلوں کا نعم البدل کوئی نہیں ہوا اور اگر ہوا تو شہر کی گلیاں و سڑکیں جو نوجوانوں کے جمع ہونے اور گفتگو کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

ہوٹلوں کے بعد دوسری تفریح سینما تھے۔ اس زمانہ میں فردوس اور نیومیجسٹک سینما میں ہر اتوار کو صبح نئی انگریزی فلم لگتی تھی۔ جس کے تین دن تک شو ہوا کرتے تھے۔ فردوس سینما میں تین حصے تھے۔ سب سے نیچے ہال تھا' اس کے اوپر گیلری اور پھر اس سے بھی اور اوپر ایک چھوٹی گیلری۔ اتوار کو صبح کے شو میں اکثر طالب علم ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا اس دن تمام دوست مل جایا کرتے تھے۔ کئی سالوں میرا یہ دستور رہا کہ ہر اتوار کو فلم دیکھنے فردوس یا نیومیجسٹک جایا کرتا تھا۔

یہ فلمیں پہلے کراچی میں آتی تھیں۔ اس لئے اکثر یہ پروگرام بھی بن جاتا تھا کہ دو ایک دوست مل کر مہران ریل کار سے کراچی جاتے' وہاں مارننگ شو دیکھتے' دوپہر کا کھانا کیفے جارج میں کھاتے' پھر میٹنی شو دیکھتے اور شام کو مہران ہی سے واپس آ جاتے۔ جب کراچی و حیدر آباد کے درمیان بسیں چلنا شروع ہوئیں تو اس سے آنے جانے میں اور آسانی ہو گئیں۔

یہ سینما دوستوں اور فیملی کے لئے تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن وی سی آر کے بعد سے یہ تفریح کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔

1952ء میں جب ہم حیدر آباد آئے ہیں تو شہر اپنی پرانی حالت میں تھا۔ اس وقت تک نہ تو نئی عمارتیں بننا شروع ہوئی تھیں اور نہ ہی نئی بستیاں۔ پرانے مکانات موسم کے لحاظ سے بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں اونچی اور دیواریں موٹی ہوتی تھیں۔ کمروں میں ہوا دان یا بادگیر ہوتے تھے۔ اس وقت تک گھروں میں پنکھے نہیں ہوتے تھے۔ مغرب سے جو ہوائیں آتی تھیں وہ ہوا دان کے ذریعہ کمروں میں آ کر انہیں ٹھنڈا کرتی

تھیں۔ جب لوگ نئے نئے حیدر آباد آئے اور چھتوں پر ان ابھرتے ہوئے ہوا دان کو دیکھتے تو انہیں تعجب ہوتا تھا کہ یہ کیا ہیں؟ کچھ نے تو یہ سمجھا کہ یہ کبوتروں کی چھتریاں ہیں۔

بہرحال جب آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو حیدر آباد میں تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اب عمارتیں کنکریٹ کی بننے لگیں۔ چھتوں سے ہوادان غائب ہونا شروع ہو گئے۔ پرانے ہوادان بھی عمارتوں میں تبدیلیوں اور اضافوں کی نذر ہو گئے۔ اب صورت یہ ہے کہ یہ ہوادان حیدر آباد میں شاذونادر ہی نظر آتے ہیں۔

بڑھتی آبادی کے لئے جب لطیف آباد کی نئی بستی بنی تو وہاں جانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا کیونکہ یہ شہر سے دور تھی اور وہاں تک لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہیں تھا مگر مجبوری لوگوں کو وہاں جانے پر آمادہ کرتی رہی۔ اب لطیف آباد ایک پورا شہر ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی بستیاں بن گئی ہیں اور سب ہی آباد ہیں۔ پرانی عمارتوں میں تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی خوبصورتی اور دلکشی باقی نہیں رہی ہے دکانوں اور مارکیٹوں نے شہر کے حسن کو ختم کر دیا ہے۔

حیدر آباد کی راتیں اب بھی مشہور ہیں۔ مگر جب شہر کھلا ہوا تھا‘ صاف ستھرا تھا‘ باغات تھے‘ ٹریفک کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا‘ اس وقت راتوں کو شہر کی سڑکوں پر چہل قدمی جو سکون دیتی تھی‘ اب اس کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ خصوصیت سے ٹھنڈی سڑک‘ دو رویہ درختوں اور شوروغل سے دور ہونے کی وجہ سے تفریح کرنے والوں کی محبوب جگہ تھی۔ یہاں ایک زمانہ تک پتھر کی بنچیں تھیں جن پر آرام کیا جاتا تھا۔ آگے چل کر شہر کا مشہور رانی باغ ہے۔ یہاں بھی لوگ پکنک منانے اور تفریح کی غرض سے آتے تھے۔ اب یہ باغ بھی اجڑ کر ویران ہو چکا ہے۔

جب تک حیدر آباد کی آبادی کم رہی‘ اس وقت تک شہر میں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جب میں گھر سے کالج اور یونیورسٹی جانے کے لئے نکلتا تو راستے میں لوگوں سے سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔ اگر حیدر آباد کا کوئی شخص کسی کو کراچی میں نظر آ جاتا تو دونوں فورا” ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملتے تھے۔ حیدر آباد سے اس

تعلق کی وجہ سے آج بھی لوگوں نے کراچی و اسلام آباد میں اپنی انجمنیں بنا رکھی ہیں لیکن اب جیسے جیسے آبادی بڑھ رہی ہے۔ لوگوں کے تعلقات اور رابطے بھی بدل رہے ہیں لوگوں کا شہر سے تعلق اور لگاؤ کم ہو گیا ہے۔ جب شہر کو اپنا نہیں سمجھا جائے گا تو پھر اسے مسخ کرنے اور بدصورت بنانے میں سب ہی مصروف ہو جائیں گے۔ یہ حیدر آباد کے ساتھ بھی ہوا اور کراچی کے ساتھ بھی۔

1960ء کی دہائی میں حیدر آباد میں ہر سال آل انڈو پاکستان مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں ہم نے جگر، جوش، فیض، جذبی، سرور بارہ بنکوی اور دوسرے بہت سے مشہور شاعروں کو سنا۔ لوگ شعروں کو سمجھتے بھی تھے، داد بھی دیتے تھے اور خوش مذاقی کے ساتھ ہوٹنگ بھی کرتے تھے۔ جوش صاحب خاص انداز سے شعر پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب انہوں نے شعر پڑھا اور اسٹیج پر بیٹھے شعراء نے مصرع نہیں اٹھایا تو انہوں نے غصہ سے کہا ”مردود، مصرع تو اٹھاؤ“ ایک مرتبہ برسات پر اپنی نظم سنانا شروع کی۔ دو باتیں بند کے بعد کہنے لگے تم اسے کیا سمجھو گے یہ کہہ کر نظم سنانا بند کر دی۔ ظاہر ہے کہ یو پی کی بارشوں اور سندھ کی بارشوں میں فرق تو ہے۔

ایک مرتبہ اس مشاعرے میں مجھے بھی والنٹیر بننا پڑا۔ ہمارے کالج کے پرنسپل مرزا عابد عباس انچارج تھے۔ شعراء کو سٹی کالج میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمیں ہدایت تھی کہ ان کو پان و سگریٹ اور چائے مسلسل ملتی رہنی چاہیے۔ کچھ شعراء کی فرمائشیں اور بڑھ گئیں تو عابد صاحب نے کہا کہ جب تک یہ غزل نہ پڑھ لیں، ان کی خواہش پوری کر دو۔ مشاعرے کے بعد یہ خود بھی کوئی فرمائش نہیں کریں گے اور ہوا بھی یہی۔

1952ء میں جب ہم حیدر آباد میں آئے تو سب سے بڑا مسئلہ میرے داخلہ کا تھا۔ میرے پاس کسی سکول کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ دراصل میرے والد نے ہماری تعلیم میں بالکل دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس لئے اب داخلہ میں مشکلات پیش آئیں۔ بڑی سفارش کے بعد خالد میموریل سکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ ملا۔ اس سکول کے بانی حیدر آباد کے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر اسماعیل نامی تھے۔ انہوں نے یہ سکول اپنے بیٹے کی یاد میں قائم کیا تھا کہ جو دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس سکول میں ان کے اپنے لڑکے

نہیں پڑھتے تھے۔ ان کا تعلق کسی زمانہ میں خاکسار پارٹی سے رہا تھا' اس لئے طلبہ کی یونیفارم خاکی تھی۔ ڈرل کے پیریڈ میں لکڑی کی بندوقوں کے ساتھ فوجی تربیت دی جاتی تھی۔

سکول کی عمارت کچی و پکی تھی۔ ایک میدان کے گرد کلاس رومز بنے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی پنکھے وغیرہ نہیں تھے۔ چونکہ میدان کچا تھا اس لئے جب ہوائیں چلتیں تو کلاس میں مٹی اڑ کر آتی اور ہم سب کو گردوغبار سے اٹا ڈالتی تھی۔ سکول میں نہ تو پینے کے پانی کا انتظام تھا اور نہ ہی ٹوائلٹ کا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی۔ اس غریبانہ حالت کے باوجود یہاں پڑھائی اچھی ہوتی تھی۔ انگریزی پڑھانے کے لئے ہمارے استاد یعقوب صاحب تھے جنہیں سب لوگ بی اے صاحب کہتے تھے۔ یہ بڑی پابندی سے کلاس میں آتے اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان کے پاس ایک سائیکل تھی جس پر سوار انہیں کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اسے ہمیشہ ہاتھ میں لئے چلتے نظر آتے تھے۔ شطرنج کھیلنے کے بڑے شوقین تھے۔ سرے گھاٹ پر ایک گلی میں گندی نالی کے پاس لوگ صبح سے شام تک شطرنج کھیلتے تھے۔ یہ شام کو وہاں پابندی سے جاتے تھے۔ میں بھی وہاں ایک آدھ بار گیا تو انہوں نے نصیحت کی کہ میں اس میں اپنا وقت ضائع نہ کروں۔ یہ وہ وقت تھا کہ استاد سادگی سے رہتے تھے۔ ٹیوشن پڑھانے کا کوئی رواج نہ تھا۔ شاگردوں کو ترقی کرتے دیکھتے خوش ہوتے تھے۔ یہی ان کا انعام تھا۔

ایک اور استاد ہمیں حساب پڑھاتے تھے۔ نام تو ان کا فیاض احمد خاں تھا مگر یہ اپنے تخلص بینش سلیمی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا پہلا پیریڈ ہوتا تھا جو میرے لئے اچھی ابتداء نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں حساب میں شروع سے کمزور تھا۔ اس لئے ان سے مار پڑا کرتی تھی۔ ہر غلطی پر ہتھیلی پر ایک رولر مارا کرتے تھے۔ جب میں پانچویں جماعت میں تھا تو میں نے سکول کے رسالہ "خالد" میں کچھ کہانیاں لکھیں لہٰذا اب یہ اس طعنے کے ساتھ مارتے تھے کہ "آپ تو کہانیاں لکھیں' آپ کو حساب سے کیا سروکار۔"

آگے چل کر ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ شعر اچھے کہتے تھے۔ مگر سناتے کم تھے۔

ان کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

جب راستے میں آ ہی گیا ہے تو دوستو
کچھ دیر میکدہ کا سماں دیکھتے چلو

تیسرے استاد مولوی صاحب تھے جو فارسی و اردو پڑھاتے۔ مزاج کے بھی سخت تھے اور سزا دینے میں بھی سخت۔ جب کسی کو دس رولر مارنے کی سزا دیتے تو کہتے تھے کہ "دس مار کر ایک گن۔" طالب علموں کو مرغا بنانا' پھر اس حالت میں انہیں کلاس میں چکر لگوانا اور ڈیسک پر کھڑا کرنا' ان کی پسندیدہ سزائیں تھیں۔ چونکہ فارسی پڑھاتے تھے اس لئے کلاس میں داخل ہوتے ہی کہتے "گردان جا" یعنی فارسی فعلوں کی گردانیں سنانا شروع کر دو۔ ان سے میری کبھی نہیں بنی۔ میری فارسی و اردو اچھی تھی۔ اس لئے ان کی گرفت میں کبھی نہیں آیا۔

اساتذہ کی ان سختیوں کی وجہ سے سکول جانے سے خوف آتا تھا۔ اس وقت تک سزاؤں کو اصلاح کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور آج بھی سزاؤں کے بارے میں یہی خیال ہے۔ سکول میں تقریری اور مضمون نویسی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ میں نے ایک سکول کے تقریری مقابلہ میں حصہ لیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جب میں اسٹیج پر تقریر کرنے لگا تو میری ٹانگیں لرز رہیں تھیں۔ آواز کپکپا رہی تھی اور سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب بار بار تقریر کرنے کا موقع ملا تو اسٹیج کا خوف جاتا رہا۔ وہیں سے میرے لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ سکول کے رسالے "خالد" میں مضامین و کہانیاں لکھیں۔ پہلی مرتبہ اپنا چھپا ہوا نام دیکھ کر اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ رسالہ رات کو سوتے ہوئے سرہانے رکھ کر سویا۔

پاکستان آنے کے بعد دو یا تین سال ضائع ہو گئے۔ جب سکول میں داخلہ لیا تو پانچویں جماعت میں ملا۔ اس لئے جب میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا تو میں نے سوچا کہ میٹرک کرتے کرتے تو میری عمر خاصی ہو جائے گی۔ اس وقت سندھ میں میٹرک کا امتحان گیارہ سال کا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے جب کسی نے مشورہ دیا کہ ادیب کا امتحان

دے کر صرف انگریزی میں میٹرک کیا جا سکتا ہے تو میں نے اس پر عمل کیا اور سکول چھوڑ کر اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ کالج ہیرا آباد میں واقع تھا۔ اس کی عمارت تقسیم سے پہلے سکھوں کا گردوارہ ہوا کرتی تھی۔ اس میں دو چھوٹے چھوٹے باغات تھے جو زنانہ و مردانہ باغات کہلاتے تھے۔ تقسیم کے بعد اس کے مردانہ باغ پر مخدوم امیر احمد' پرنسپل اورینٹل کالج نے قبضہ کرکے کالج کھول لیا' تو زنانہ باغ پر حاذق علی' جو شہر کے ایک سیاستدان تھے' ان کا قبضہ ہوا۔ اور انہوں نے وہاں سکول کھول لیا۔ اس گردوارے کی لائبریری اورینٹل کالج کے حصہ میں آئی۔ اس کی الماریوں میں تالے پڑے رہتے تھے اور کسی کو ان کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے داخلہ کے وقت تک باغ اچھی حالت میں تھا' اس کے لان' درخت اور بیچ میں فوارہ اس کی خوبصورتی کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اب یہ نشانات مشکل سے ملیں گے۔

مخدوم امیر احمد صاحب کے پاس کوئی ڈگری یا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ اس لئے یہ خود کو فاضل الحرمین کہتے تھے۔ چلتے پھرتے پرزے تھے' پیسہ ان کی کمزوری تھا۔ اس لئے فیس کے معاملہ میں کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ حکومت سے جو گرانٹ ملتی تھی وہ سب ان کی جیب میں جاتی تھی۔ استادوں سے پوری تنخواہ پر دستخط کرا کے آدھی ان کو دیتے تھے۔ ملنے ملانے میں اچھے تھے۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی ان کے لباس کا حصہ تھیں۔ تلک چاڑی سے کالج تک بگھی میں آتے۔

کالج میں طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی۔ کلاس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان پردہ ڈال دیا جاتا تھا چونکہ کالج کے اوقات شام کے تھے اس لئے اس میں انہوں نے داخلہ لے رکھا تھا جو دن میں ملازمت کرتے تھے۔ ادیب کا امتحان دینے کے لئے جو پڑھائی کی اس میں کافی مزہ آیا۔ اردو ادب خوب پڑھا۔ اس وقت تک صرف سالانہ امتحانات ہوا کرتے تھے۔ سپلیمنٹری اور ڈیپارٹمنٹل کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اگر کوئی ایک پرچہ میں فیل ہو جائے تو اسے دوبارہ سے سالانہ امتحان میں شریک ہونا ہوتا تھا۔ پرائیویٹ امتحان دینے کی اجازت صرف سکول ٹیچرز کو ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب تھے جو آزاد کہلاتے تھے۔ پتہ نہیں کب سے ادیب کا امتحان دے رہے تھے۔ ہر

بار کچھ پرچوں میں پاس ہو جاتے تھے اور کچھ میں فیل۔ دیکھا جائے تو انہوں نے ایک ایک کرکے سارے مضامین پاس کر لئے تھے۔ مگر سب میں ملا کر کبھی پاس نہیں ہوئے۔

اورینٹل کالج میں اگرچہ طالب علم تو کم تھے مگر پھر بھی غیرنصابی سرگرمیاں ہو جاتی تھیں۔ پرنسپل صاحب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ پیسے خرچ نہ ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سٹی کالج حیدر آباد میں ہر سال کل پاکستان مباحثے بڑے زور و شور سے ہوا کرتے تھے۔ 1956ء میں جو مباحثہ ہوا' اس میں اورینٹل کالج کی نمائندگی میں نے کی۔ اس سال کا موضوع تھا "اس ایوان کی رائے میں بنگالی کو بھی پاکستان کی قومی زبان ہونا چاہیے" جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کالج پہنچا اور وہاں ایک بڑا شامیانہ اور لوگوں کا ہجوم دیکھا تو میں نروس ہو گیا۔ سٹی کالج والوں نے بھی ہماری ٹیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ہمارا نمبر سب سے آخر میں رکھ دیا۔ مباحثہ پانچ بجے سے شروع ہوا اور رات کو بارہ بجے تک جاری رہا۔ میں اس موضوع کی حمایت میں بولنے والا آخری مقرر تھا۔ سامعین اس وقت تک تھک چکے تھے۔ اس لئے کسی نے میری تقریر کو غور سے نہیں سنا۔ لیکن اتنے بڑے مجمع میں بول کر اعتماد کا احساس ضرور پیدا ہو گیا۔

میں نے 1956ء میں ادیب کا امتحان پاس کیا اور 1957ء میں انگریزی کا پرچہ دے کر میٹرک کیا۔ اس وقت تک ہمارے گھر کے مالی حالات انتہائی خراب ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد والد کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ کاروبار کریں۔ اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے کاروبار شروع کیا مگر چونکہ انہیں تجربہ بالکل نہیں تھا اس لئے نقصان ہوا۔ یہاں تک کہ کاروبار میں لگانے کے لئے کوئی پیسہ نہیں رہا۔ جب پیسہ ختم ہو گیا تو انہیں کاروبار کا تجربہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر پیسہ ہو تو بغیر تجربہ بھی کاروبار ہو سکتا ہے' مگر بغیر پیسہ کے چاہے کتنا ہی تجربہ کیوں نہ ہو کاروبار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ وقت آیا کہ جب والدہ کے زیورات ایک ایک کرکے بک گئے۔ آخر بڑی مشکلوں سے ایک جگہ ملازمت ملی' مگر تنخواہ اس قدر تھوڑی تھی کہ بس گزارہ ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں مخدوم امیر احمد صاحب کو خیال آیا کہ کالج کی عمارت صبح کے وقت خالی رہتی ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس میں ایک پرائمری سکول کھولا جائے۔ چنانچہ اس منصوبہ

پر عمل ہوا اور عمارت پر اسلامیہ ماڈرن پرائمری سکول کا بورڈ لگ گیا۔ اس سکول میں سب سے پہلے میرا تقرر ہوا۔ ہم نے ہیرا آباد میں مکانوں کی دیواروں پر سکول میں داخلہ کے پوسٹر لگائے۔ جب داخلہ کا وقت آیا تو اچھی خاصی تعداد میں بچوں نے داخلہ لیا۔ ابتدا میں تو میں اکیلا ہی استاد تھا، مگر جب کلاسیں بڑھیں تو نئے استادوں کا بھی تقرر ہونے لگا اور ایک صاحب بطور ہیڈ ماسٹر بھی آ گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب امریکہ سے خشک دودھ اور گھی کے ڈبے سکولوں میں آتے تھے۔ چنانچہ روز پانی کی ایک بڑی ٹینکی میں دودھ گھولا جاتا تھا اور یہ دودھ بچوں کو پلایا جاتا تھا۔ باقی ڈبے جو بچتے تھے ان میں ایک ایک ہر استاد کو اور بقایا ہیڈ ماسٹر اور مخدوم صاحب کے ہاں چلے جاتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے حصے کے ڈبوں کو حلوائیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ شاید یہی مخدوم صاحب بھی کرتے ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میرا پہلا مہینہ ختم ہوا تو مخدوم صاحب نے چالیس روپیہ نکال کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ اگرچہ یہ بہت کم تھے، مگر اس سلسلہ میں بحث فضول تھی لہٰذا اس تنخواہ پر کام کرتا رہا۔ ایک مرتبہ جب میں نے شکایت کی کہ دودھ کے ڈبوں کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا ہے تو مخدوم صاحب نے بلا کر بڑی نرمی اور محبت سے کہا کہ اگر میں سکول چھوڑ دوں تو انہیں اس کا افسوس نہیں ہوگا۔ میں نے سکول تو چھوڑ دیا، مگر میری تنخواہ بھی امیر صاحب نے ضبط کر لی۔ ملازمت سے برطرف ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

ابھی میں کسی اور ملازمت کی تلاش میں تھا کہ ہائی سکول کے استاد وصی مظہر ندوی، جو کہ جماعت اسلامی کے رکن تھے، بعد میں حیدر آباد کارپوریشن کے میئر بھی ہوئے انہوں نے کہا کہ جماعت نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا نام مجلس تحفظ اخلاق عامہ ہے۔ اس کے لئے انہیں آفس سیکرٹری کی ضرورت ہے اگر میں اس حیثیت میں کام کروں تو وہ مجھے اتنی ہی تنخواہ جتنی سکول سے ملتی ہے، دینے کو تیار ہیں، چنانچہ میں سکول کے استاد سے اس تنظیم کا آفس سیکرٹری ہو گیا۔ اس کا دفتر گاڑی کھاتہ میں جماعت اسلامی کے دفتر ہی میں تھا۔ ایک کونہ میں میز اور چند فائلیں اس تنظیم کا اثاثہ

تھیں۔

اس تنظیم کی میٹنگیں مہینہ میں ایک یا دو بار ہوتی تھیں۔ دو یا تین مہینے کے عرصہ میں اخلاق عامہ کو سدھارنے کے لئے ہم نے یہ کیا کہ حیدر آباد کے چند سینماؤں کو قانونی نوٹس بھجوائے کہ انہوں نے پوسٹروں پر عورتوں کی تصویر چھاپ کر لوگوں کے اخلاق کو بگاڑا ہے‘ لہٰذا کیوں نہ ان کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے۔ کسی نے بھی نہ تو ان نوٹسوں کا جواب دیا اور نہ ہی تنظیم کورٹ میں گئی۔ لیکن اس عرصہ میں میرے تعلقات تنظیم سے کشیدہ ہو گئے کیونکہ دو یا تین مہینے گزرنے کے بعد بھی تنخواہ کا کسی نے نہیں پوچھا۔ آخر ایک دن ہمت کر کے میں نے مطالبہ کر ہی دیا۔ اس پر کہا گیا کہ تنظیم کی مالی حالت بڑی خراب ہے‘ اس لئے تنخواہ دینا مشکل ہے لہٰذا میں رضاکارانہ طور پر اپنی تنخواہ بطور چندہ تنظیم کو دے دوں۔ میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ ملازمت ضرورت کے تحت کی ہے۔ اس لئے میں نے جو وقت دیا ہے اس کے پیسے تو لوں گا۔ جب میں نے عطیہ دینے سے بالکل انکار کر دیا تو بڑی ناراضگی کے ساتھ میرے بقایا جات ادا کئے گئے اور ساتھ ہی میں ملازمت سے جواب دے دیا گیا۔ برطرفی کا یہ دوسرا تجربہ تھا‘ جو بہت جلد ہوا۔

میٹرک کے بعد میں نے سٹی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ شام کا کالج تھا اور یہاں پر طالب علموں کی اکثریت وہ تھی جو دن میں ملازمت کرتے تھے۔ حیدر آباد میں اس کالج نے تعلیم کے فروغ میں بڑا حصہ لیا اور ان نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کئے جو اپنی ملازمتوں کی وجہ سے دن میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ خاص طور سے تقسیم کے بعد میری اور مجھ سے پہلی کی نسل کو جن حالات سے سابقہ پڑا تھا‘ اس میں شام کے کالج نے میٹرک کے بعد تعلیم کو جاری رکھنے میں مدد دی۔ کالج میں داخلہ صرف دس روپیہ دے کر مل جاتا تھا۔ بہت کم طالب علم تھے جو پندرہ روپیہ ماہوار فیس پابندی سے دیتے ہوں۔ سال بھر کی فیس اس وقت ادا کی جاتی تھی جب امتحان کے فارم بھرنا ہوتے تھے۔ اس وقت بھی کم ہی طالب علم پورے سال کی فیس ادا کرتے تھے۔ لیکن کالج کی یہ روایت تھی کہ جس نے جو رقم دے دی‘ اتنی لے کر اس کا فارم بھیج دیا جاتا تھا۔

کبھی کسی طالب علم کا فارم فیس کی ادائیگی کی وجہ سے روکا نہیں گیا۔

اساتذہ کو وہی تنخواہ ملتی تھی جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر تھی۔ اس طرح سالانہ اضافہ بھی ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کالج میں اچھے اور قابل اساتذہ تھے۔ کالج کی عمارت بڑی خوبصورت تھی۔ تقسیم سے پہلے یہ لڑکیوں کا سکول ہوا کرتا تھا۔

سٹی کالج نے ابتداء ہی سے اپنی روایات بنائیں تھیں۔ ان میں سالانہ مباحثوں کا انعقاد تھا۔ جب کالج کی جانب سے پہلی مرتبہ انگریزی مباحثہ کے دعوت نامہ بھیجے گئے تو کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد جب کالج نے کہا کہ وہ تمام ٹیموں کو آنے جانے کا خرچہ دے گا تو اس قدر ٹیمیں آئیں کہ مباحثہ دو دن تک جاری رہا۔ اس نے کالج کے مباحثہ کا معیار مقرر کر دیا۔ ان مباحثوں میں انعامات کے لئے سخت مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہا جاتا تھا کہ جس نے سٹی کالج کے مباحثہ میں پہلا انعام جیت لیا اس نے مقرری میں آخری حدوں کو چھو لیا۔ ایک بار ایک صدر مباحثہ نے کہا تھا کہ اس مباحثہ میں اول آنے والے کو ریٹائر ہو جانا چاہیے۔

پورے پاکستان میں آل پاکستان مباحثے بڑی پابندی اور وقت سے ہوتے تھے۔ یہ اکتوبر میں کوئٹہ سے شروع ہوتے۔ نومبر میں حیدر آباد و کراچی میں اور دسمبر و جنوری میں پنجاب میں ہوا کرتے تھے۔ سرحد سے مقررین تو آتے تھے، مگر مباحثے وہاں کم ہی ہوتے تھے۔

مباحثوں کے موضوعات سیاسی، معاشی اور سماجی ہوتے تھے۔ سیاسی موضوعات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن جب ایوب خاں کا مارشل لاء آیا تو کالج والے خود احتیاط کرنے لگے اور سیاسی موضوعات سے کترانے لگے۔ اس وقت مباحثوں کی صدارت مشہور سیاسی و ادبی شخصیتوں سے کرائی جاتی تھی۔ مباحثوں کے جج بھی کالج کے اساتذہ یا ادبی لوگ ہوا کرتے تھے۔

مباحثوں کی وجہ سے مجھے اس بات کا موقع ملا کہ میں حیدر آباد سے باہر نکل سکوں اور پاکستان کے دوسرے شہروں کو دیکھ سکوں ۔ 1957ء میں، میں پہلی بار کالج ٹیم کے ساتھ لاہور آیا اور یہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج اور

ایف سی کالج کے مباحثوں میں حصہ لیا۔ چونکہ مباحثے متواتر ہوتے تھے اس لئے ان کی وجہ سے بولنے کی خوب تربیت ہوئی اور فی البدیہ تقریر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں رہی۔ لاہور سے ہم لائل پور اور بہاولپور گئے۔ چھوٹے شہروں میں مباحثے مقبول تھے اور لوگ بڑی تعداد میں انہیں سننے کے لئے آتے تھے۔ مباحثوں میں تقریر کرتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ مقرر کی شخصیت اسٹیج پر جا کر کس قدر اہم ہو جاتی ہے۔ اگر مقرر کو زبان و بیان پر اختیار ہو اور وہ جذبہ و جوش کے ساتھ تقریر کرے تو لوگ سحر زدہ ہو جاتے ہیں اور مقرر ان کے دل و دماغ پر قابو پا لیتا ہے۔ مجھے کئی بار تقریر کر کے ایسی اندرونی مسرت ہوئی کہ اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اگر مجمع آپ کو غور سے سن رہا ہو اور ان کے چہروں پر جذباتی کیفیت طاری ہو تو اس سے مقرر کو بھی بے انتہا مسرت ملتی ہے۔

لیکن ایک خاص بات جو اکثر اچھے مقررین میں تھی وہ یہ کہ وہ تقریر میں لفاظی سے کام لیتے تھے۔ اچھی زبان کو اہمیت دیتے تھے۔ دلیل، فلسفیانہ یا نظریاتی باتوں کی ان میں بہت کم گنجائش ہوتی تھی۔ اس لئے ایسی تقریریں کی جاتی تھیں کہ جن میں جذباتیت ہو چاہے معنی نہ ہوں۔ اس وجہ سے کچھ مقررین نے چنگیز و ہلاکو کے مظالم اور ہیروشیما و ناگاساکی میں ایٹم بم کے موضوعات کو اپنا پسندیدہ موضوع بنا رکھا تھا چاہیے مباحثہ کا موضوع کچھ ہو وہ کھینچ تان کر اس کو اپنی دلیل میں لے آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مقرر کو جن کی فرنچ کٹ داڑھی تھی بڑے جذباتی انداز میں بولے کہ "جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرایا گیا" تو سامعین میں سے کسی نے جملہ کسا "اور آپ کی داڑھی اڑ گئی۔"

تقریروں میں اشعار پڑھنے کا بھی بہت رواج تھا۔ کچھ اشعار اس قدر پڑھے گئے تھے کہ ان کو سن سن کر لوگ تھک چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد مباحثوں میں تنوع نہیں رہا۔ ایک ہی قسم کے موضوعات اور ایک ہی قسم کی تقریریں بار بار ہونے لگیں۔ جب ایوب خاں کی آمریت آئی تو موضوعات میں اور زیادہ کمی ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی دلچسپی ان مباحثوں میں کم ہوتی چلی گئی اور ایک وقت میں تو یہ

روایت ختم ہی ہو گئی۔ اگرچہ اب دوبارہ سے ان کے احیاء کی کوشش ہو رہی ہے۔ مگر میں نے کچھ مباحثوں میں شرکت کرکے دیکھا ہے کہ مقررین اب پہلے سے زیادہ جذباتیت کا شکار ہو گئے ہیں یہ سیاسی مقررین کا اثر ہے کہ جو سامعین کے سامنے صرف چیختے چلاتے ہیں۔ وہی انداز اب مباحثوں میں مقرروں نے اختیار کر لیا ہے۔

ادارے کیوں بنتے اور کیوں ٹوٹتے ہیں؟ اس کے پس منظر میں تبدیلی کا مسلسل عمل ہوتا ہے جو ادارے تبدیلی کے عمل کے ساتھ خود کو نہیں بدلتے ہیں' تو وہ فرسودہ ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ مباحثوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب تک نئے نئے موضوعات پر بحث ہوئی' لوگوں کی دلچسپی ان میں رہی' لیکن جب موضوعات دہرائے جانے لگے اور ایسے موضوعات کا انتخاب کیا گیا کہ جن کا معاشرے کے مسائل سے تعلق نہیں تھا تو نئے فکری زاویئے اور خیالات پیدا ہونا بند ہو گئے۔ اس لئے جب جمہوری روایات ختم ہوئیں اور آمریت قائم ہوئی تو اس نے سوچنے پر پابندی لگا دی۔ اگرچہ آمریت تو ان پابندیوں کے باوجود خود کو برقرار نہیں رکھ سکی۔ مگر ان پابندیوں نے آنے والی نسلوں کو غور و فکر اور تخلیقی صلاحیتوں سے محروم کر دیا۔ ایوب خاں کی آمریت کے جو اثرات ہوئے اس کا تجربہ مجھے بحیثیت طالب علم اور استاد کے ہوا۔

جب میں کالج میں داخل ہوا ہوں تو یہاں یونین کے الیکشن انتہائی زور و شور سے ہوتے تھے۔ سٹی کالج میں یہ روایت تھی کہ امیدوار پارٹی بنا کر الیکشن لڑا کرتے تھے۔ اگرچہ آزاد امیدوار بھی ہوا کرتے تھے۔ الیکشن کے موقع پر ہرپارٹی اپنے امیدواروں کی لسٹ شائع کرتی تھی۔ اپنا اخبار نکالتی تھی۔ تقریریں کی جاتی تھیں' پوسٹر چھپتے تھے اور زور و شور سے کنویسنگ ہوتی تھی۔ طالب علموں کے لئے یہ ایک موقع ہوتا تھا کہ وہ جمہوری روایات سے واقف ہوں۔

الیکشن کے بعد نئی یونین کا افتتاح ہوتا تھا۔ نئے عہدیدار حلف لیتے تھے اور اس طرح نئی یونین سال بھر پروگراموں کا انعقاد کراتی تھی۔ مجھے الیکشن لڑنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا۔ سکول اور کالج میں' میں کسی نہ کسی عہدے کے لئے منتخب ہوتا رہا۔ 1957ء میں سٹی کالج میں فرسٹ ایئر کا نمائندہ منتخب ہوا۔ اس یونین کا افتتاح مشرقی

پاکستان کے ایک وزیر مولوی فرید احمد نے کیا تھا۔ جو بعد میں مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن میں مارے گئے۔ میرا آخری الیکشن 1961ء میں یونین کے وائس پریذیڈنٹ کا تھا۔ جب صوبہ سندھ میں انٹر کالجیت باڈی بنائی گئی تو میں اس کا بھی وائس پریذیڈنٹ ہوا۔

اس وقت طالب علموں اور لوگوں میں گہرا رشتہ اور تعلق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی ہم نے جلوس نکالا اور حکومت کے خلاف تحریک چلائی تو لوگوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ جلوس نکالتے ہوئے نعرہ بازی ضرور ہوتی تھی۔ مگر توڑ پھوڑ نہیں۔ اسی زمانہ میں پہلی مرتبہ میرا واسطہ سی آئی ڈی کے لوگوں سے پڑا۔ ان کی حرکات و سکنات اور طریقے بڑے بھدے اور بھونڈے ہوتے تھے۔ مثلاً کالج کے باہر ایک پان کی دکان پر کھڑے طالب علموں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ جب ہم باہر نکلتے تو یہ منہ موڑ کر سگریٹ پینے لگتے اور ظاہر کرتے کہ جیسے انجان لوگ ہوں۔ شام کو یہ گاڑی کھاتہ میں سلطان ہوٹل کے باہر اخبار فروشوں کے اسٹال پر بیٹھا کرتے تھے۔ بعد میں ان لوگوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ یہ اپنا کام کرتے تھے اور ہم اپنا۔

طالب علموں کی مخالفت کی وجہ سے ایوب خان نے تعلیمی اداروں سے یونین کا خاتمہ کر دیا۔ جب طالب علموں کے لئے جمہوری راستے بند کر دیئے گئے تو آہستہ آہستہ انہوں نے تشدد کو اپنایا۔ آج جو تعلیمی اداروں میں طالب علموں کا تشدد اختیار کرنا ہے' اس کی ابتداء ایوب خاں سے ہوئی تھی۔ انہوں نے درحقیقت طالب علموں کو غیرسیاسی ا کر' جمہوری روایات پر کاری ضرب لگائی۔ المیہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی چاہے وہ آمرانہ ہوں یا جمہوری' اس کو اپنے حق میں پایا' اس لئے آج تک علیمی اداروں میں انتخاب نہیں ہوتے۔

کالج کے دنوں میں جن استادوں نے مجھے متاثر کیا ان میں خان عزیز' ہمارے ریزی کے استاد تھے۔ بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ یہ صدر میں رہتے تھے وہاں سے پیدل چل کر تلک چاڑی ہوتے ہوئے سٹی کالج آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رسٹ ایئر کی ٹیکسٹ بک ہوا کرتی تھی۔ تلک چاڑی کا ایک دکاندار انہیں کئی سال سے نت پر کالج جاتے اور کتابیں ہاتھ میں لئے دیکھتا تھا۔ ایک دن اس سے نہیں رہا گیا اور

روک کر کہنے لگا کہ "میں کئی سال سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم وقت پر کالج جاتے ہو۔ صورت سے بھی شریف اور ذہین لگتے ہو۔ پھر کیا بات ہے کہ تم اب تک فرسٹ ایئر کا امتحان پاس نہیں کر سکے۔"

خان عزیز خود بھی طالب علمی کے زمانہ میں مقرر اور یونین کے عہدے دار رہ چکے تھے۔ اس لئے انہیں ان سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میرے زمانہ میں یونین کے انچارج وہی ہوا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے لکچرر شپ چھوڑ کر لاء کی پریکٹس شروع کر دی اور ایک کامیاب وکیل بن گئے۔ ہمارے ہاں استاد کا جو گرا ہوا سماجی مرتبہ ہے، اس کی وجہ سے کئی لائق و فاضل لوگ اس سے بیزار ہو کر دوسرے پیشوں میں چلے گئے۔

بی۔ اے میں ہمیں جنرل ہسٹری پڑھانے کے لئے تفضل داؤد تھے۔ یہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ شیروانی میں رہتے تھے۔ سر پر مخملی ٹوپی، سردیوں میں گلے میں مفلر، سیدھے سادھے اور صحیح معنوں میں ایک اسکالر۔ کلاس میں انتہائی پابندی سے اور وقت پر آتے تھے۔ میں نے دو سال تک کالج میں ان سے پڑھا، مجھے یاد نہیں کہ اس عرصہ میں انہوں نے کبھی ناغہ کیا ہو۔ ایک بار جب کہ حیدر آباد میں ہسٹری کانفرنس ہو رہی تھی تو انہوں نے ایک مہینہ پہلے یہ اعلان کر دیا تھا فلاں دن وہ پیریڈ نہیں لیں گے۔ بی۔ اے کے سال دوم میں جنرل ہسٹری میں ہم دو یا تین طالب علم تھے۔ ہمارا پیریڈ پہلا ہوا کرتا تھا۔ اگر ہمیں دیر ہو جاتی تو وہ کلاس میں بیٹھے ہوئے ملتے تھے۔ اگر کوئی نہیں آتا تو خود 45 منٹ کلاس میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔

سٹی کالج رات کا کالج تھا۔ اس لئے جب کبھی بجلی چلی جاتی تھی تو کلاسیں خود بخود ختم ہو جاتی تھیں۔ اس حادثہ کے پیش نظر داؤد صاحب ہمیشہ شیروانی کی جیب میں موم بتی رکھ کر لاتے تھے۔ اگر بجلی چلی جاتی تو موم بتی کی روشنی میں پڑھاتے تھے۔

میری ان سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ میں ان سے کالج کے علاوہ بھی ملتا رہتا تھا۔ وہ کالج کے قریب ہی ایک ہوٹل میں رہتے تھے۔ یہاں ان کے ساتھ کالج کے اور استاد بھی تھے۔ خاص طور سے وہ کہ جن کے خاندان کراچی میں تھے اور وہ یہاں ملازمت

کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ داؤد صاحب جونپور کے رہنے والے تھے۔ الہ آباد سے ہسٹری میں ایم۔ اے کیا تھا۔ سیاسی خیالات کے اعتبار سے پکے مسلم لیگی تھے۔ جب جادوناتھ سرکار کی کتاب "شیوا جی دی گریٹ" چھپی تو انہوں نے اس کے جواب میں "ریل سیوا جی" لکھی۔ اس کی ایک کاپی جادوناتھ سرکار کو بھیجی اور پھر خود اس سے ملنے کلکتہ گئے۔ کہتے تھے کہ جب میں اس سے ملا اور بتایا کہ میں جونپور سے آیا ہوں تو وہ سمجھا کہ میں "شرقی سلاطین جونپور" کا مصنف ہوں۔ مگر جب میں نے بتایا کہ میں "ریل سیوا جی" کا مصنف ہوں تو وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔

کہتے تھے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ان کو متعصب ہندوؤں کی جانب سے دھمکیاں ملنے لگیں تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک تقسیم ہو چکا تھا لہٰذا وہ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے پاکستان چلے آئے۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ابتداء تو قوم پرست نقطہ نظر سے ہوئی' اس میں ہندو مورخوں کا بڑا حصہ ہے کہ جنہوں نے خصوصیت سے مغلوں کی تاریخ کو جدید انداز میں لکھا۔ الہ آباد یونیورسٹی ان قوم پرست مورخود کا مرکز تھی۔ بعد میں تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر آیا۔ ردعمل کے طور پر دونوں جانب سے تاریخ کو مسخ کر کے لکھا گیا۔ کبھی کبھی انسان ذاتی طور پر فرقہ وارانہ صورتحال سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور اس کا اس نقطہ نظر سے جذباتی تعلق بن جاتا ہے۔ ان میں رواداری اور قوت برداشت بہت تھی۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو سنتے بھی تھے' لیکن اگر ان کے خیالات پر ذرا بھی زد پڑتی تو انہیں اس سے سخت صدمہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کلاس میں' میں نے سرسید پر تنقید کر دی۔ میرے الفاظ سن کر ان کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے اور بڑے دکھ سے بولے : "مبارک علی خاں صاحب' آپ نے ہمیں بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے پورے پیریڈ میں سرسید کی خدمات پر روشنی ڈالی۔

انہوں نے کانگریس کے قیام پر ایک کتاب لکھی تھی۔ بڑی محنت سے اس کا

مسودہ ٹائپ کرایا تھا۔ ان کی اس کتاب کا مسودہ ان کی دوسری تحریروں کے ساتھ ان کی وفات کے بعد نہ جانے کہاں گیا؟

وہ پاکستان کے حالات سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ مگر یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان پر احتجاج کیا جائے۔ جب ہم طالب علموں نے ایوب خاں کے خلاف مہم چلائی تو مجھ سے سخت ناراض ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے پاکستان کمزور ہوگا۔ اس طرح وہ دائیں بازو کے نظریات کے سخت خلاف تھے اور کمیونسٹوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ وہ خود کٹر مذہبی نہیں تھے۔ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے کہ جن کے لئے پاکستان ایک نازک سی چیز تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے ذرا بھی چھیڑا جائے۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ ٹوٹ نہ جائے۔

وہ ملک کے حالات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور جہاں ضرورت ہوتی اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو شملہ جا رہے تھے تو انہوں نے ایک طویل خط لکھ کر کشمیر کے مسئلہ پر اپنی رائے دی تھی اور بتایا تھا کہ کون کون سے پوائنٹس اہم اور ضروری ہیں کہ جنہیں کانفرنس میں اٹھانا چاہیے۔ ایران میں جب خمینی کا اقتدار قائم ہوا تو اسے بھی طویل ٹیلی گرام دے کر اس کی آمرانہ پالیسیوں کی مذمت کی۔

داؤد صاحب کا بات کرنے کا سلیقہ بڑا خوبصورت تھا۔ جب بھی مخاطب ہوتے تو پورا نام لیتے تھے اور بڑے دھیمے انداز میں بات کرتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ ان کی بیوی عرصہ ہوا وفات پا چکی تھیں، اس لئے کھانا وہ ہمیشہ ہوٹل میں کھاتے تھے۔ جب بھی ان کے ساتھ چائے پینے ہوٹل جانا ہوتا، بل خود ادا کرتے تھے۔ چھوٹی گٹی کا ہوٹل ڈی پیرس انہیں پسند تھا کیونکہ وہ بڑا صاف ستھرا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ہوٹل میں اگر انہیں کوئی شاگرد نظر آ جاتا تو بیرے سے کہہ کر اسے بھی اپنی طرف سے چائے بھجوا دیا کرتے تھے۔ جب میں بی۔ اے میں تھا اور میرے مالی حالات خراب تھے تو انہوں نے کچھ مہینے مجھے تیس روپیہ بطور وظیفہ دیا۔

انہوں نے کالج سے خود ریٹائرمنٹ لے لی کیونکہ ان کے مضمون میں طالب علم کم آتے تھے۔ اس لئے کہنے لگے کہ مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی چلے گئے۔ یہاں لارنس روڈ پر بی پی فیکٹری میں ان کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ میں جب بھی کراچی جاتا تو ان سے ملنے وہاں ضرور جایا کرتا تھا اور وہ دوپہر کا کھانا کھلانے کسی قریبی ہوٹل میں لے جاتے تھے۔ انہوں نے کانگریس پر جو کام کیا تھا اس کے شائع کرانے کے بارے میں ذکر کرتے تھے۔ اس وقت تک میرے بھی پبلشرز سے کوئی تعلقات نہیں تھے۔ اس لئے ان کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اپنی اس مجبوری کے بارے میں ایک دن انہوں نے بڑی خوبصورت بات کہی: ''مبارک علی خان! ہم نے زندگی میں ایک بڑی غلطی کی اور وہ یہ کہ شہرت کی کبھی خواہش نہیں کی۔'' اس شہرت کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تحریریں شائع نہ ہو سکیں۔

ان کی اس بات سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی خاکساری میں رہتا ہے تو پھر کسی کو اس کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ انکساری اور خاکساری اپنی جگہ، مگر اپنی شخصیت کو ابھارنے اور منوانے کے لئے شہرت بڑی ضروری چیز ہے۔

جب میں جرمنی سے واپس آیا تو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے مجھے معطل کر دیا جس کا انہیں سخت دکھ ہوا۔ آخری بار جب میں ان سے ملنے گیا ہوں تو وہ فلیٹ پر نہ تھے۔ میں نے اپنی ایک کتاب جو چھپ چکی تھی فلیٹ کے اندر ڈالی اور چلا آیا۔ اس کے کچھ دن بعد جنگ میں رئیس امروہوی کے کالم میں ان کی وفات کے بارے میں پڑھا۔ شہرت کے نہ ہونے نے ایک عالم کو بھلا دیا۔ اس کے بعد سے کچھ پتہ نہیں چلا کہ ان کی لائبریری کا کیا ہوا؟ اور ان کے مسودے کہاں گئے؟

کالج کے پرنسپل مرزا عابد عباس تھے جو اساتذہ اور طلبہ میں مقبول تھے۔ یہ کالج کی سرگرمیوں میں خصوصیت سے دلچسپی لیتے تھے۔ ہمیں جب بھی مباحثوں میں جانا ہوتا اور پیسوں کی ضرورت ہوتی تو یہ بلا تامل پیسے دے دیا کرتے تھے۔ مجھے اس سلسلہ کا ایک واقعہ یاد ہے۔ 1959ء میں ہم مباحثوں میں شرکت کے لئے لاہور آئے۔ ہمارے ساتھ منظر اکبر مرحوم بھی تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم کالجوں کے ہاسٹلوں میں ٹھہرنے کے بجائے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ اس کا بل ان کالجوں سے وصول کر لیں گے جہاں جہاں مباحثوں میں بولیں گے۔ سٹیشن کے پاس ایک ہوٹل تھا' لاہور ہوٹل' اس

میں ہم لوگ ٹھہر گئے۔ جب ہم نے کالجوں سے بل کے لئے کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مقرروں کے لئے ہاسٹل میں انتظام تھا، ہمیں وہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ اس عرصہ میں ہوٹل کا بل کوئی ڈیڑھ ہزار ہو گیا تھا، جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی۔ اب ہم ہوٹل کے قیدی تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عابد صاحب کو تار دے کر رقم منگائی جائے اور بعد میں ہم سب مل کر یہ رقم کالج کو ادا کر دیں گے۔ عابد صاحب نے بذریعہ ٹیلی گراف رقم بھجوا دی، ہم نے فوراً بل ادا کیا اور واپس حیدر آباد پہنچے۔ جب کالج گئے اور عابد صاحب سے ملے تو سب کو ڈر تھا کہ ڈانٹ پڑے گی۔ مگر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ جب انہوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس واقعہ کو گزرنے کے کافی عرصہ بعد جب میں طالب علم نہیں رہا تھا، میں نے ایک دن عابد صاحب کو وہ واقعہ یاد دلاتے ہوئے پوچھا کہ انہوں نے ہم لوگوں کو ڈانٹا کیوں نہیں۔ تو وہ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ طالب علموں کی ایسی غلطیوں کو معاف کر دینا چاہیے۔

عابد صاحب کی وجہ سے کالج میں جان تھی۔ مباحثوں میں جو مقررین باہر سے آتے وہ ان کی شخصیت سے بے انتہا متاثر ہوتے تھے۔ تقریر بھی اچھی کرتے تھے۔ طالب علموں کو اپنے حق میں کرنا انہیں آتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک طالب علم رہنما نے اس مسئلہ کو اٹھایا کہ کالج دس روپیہ سالانہ عمارت کی تعمیر کے فنڈ میں لیتا ہے مگر اس کا کوئی حساب نہیں دیتا ہے۔ جنرل باڈی میٹنگ بلائی گئی جہاں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ عابد صاحب میٹنگ میں آئے اور آخر میں تقریر کرتے ہوئے طالب علموں کو سمجھایا کہ یہ تمام فنڈ محفوظ ہے اور کالج کی عمارت کی تعمیر کے لئے ہے۔ اس میں ان کا حصہ سال میں ایک روپیہ ماہانہ سے بھی کم ہے۔ جب کہ طالب علم کالج کو نہ تو پورے سال کی فیس دیتے ہیں اور نہ ہی کالج کی آمدنی کا اور ذریعہ ہے۔ تقریر کے بعد سب مطمئن ہو گئے اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

وہ اور کالج دونوں اس قدر گھل مل گئے تھے کہ ان کے بغیر کالج کا تصور ناممکن تھا۔ جب انہوں نے 1961ء میں کالج چھوڑا اور سیکنڈری بورڈ کے سیکرٹری ہو گئے تو ان کے بعد سے کالج کو ان جیسا کوئی دوسرا پرنسپل نہیں ملا۔

جب میں 1974ء میں کچھ دنوں کے لئے جرمنی سے آیا تو پتہ چلا کہ بھٹو کے دور حکومت میں جہاں اور لوگوں کو ملازمت سے نکالا گیا ان میں عابد صاحب بھی تھے۔ اس معاشرے میں ایماندار اور صاحب کردار لوگوں کا جو حشر ہوا ہے، آج یہ خرابیاں اسی کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے کچھ وقت بڑی پریشانی میں گزارا۔ آخر دوبارہ سے وہ بورڈ میں آئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

سٹی کالج میں جو چار سال گزارے، وہ زندگی کے یادگار دن تھے۔ یہ شام کا کالج تھا اور کلاسز پانچ بجے شروع ہو کر نو بجے ختم ہوتی تھیں۔ اس وقت تک یہاں اکثریت ان طالب علموں کی تھی کہ جو ان میں ملازمت کرتے تھے۔ یہ آفس کا کام ختم کر کے تھکے ہارے کالج میں آیا کرتے تھے۔ کچھ ایسے تھے کہ جو گھر جا کر نہا دھو کر آتے۔ طالب علموں میں دکاندار بھی تھے۔ کاروبار کرنے والے بھی اور سرکاری و غیر سرکاری ملازم پیشہ بھی۔ اکثریت کلاسز میں پابندی سے آتی تھی۔

اگرچہ کالج پرائیویٹ تھا، مگر جنہوں نے اسے کھولا تھا ان کا ایک مقصد تھا: تعلیم کا فروغ، اس کالج نے بہت سے نوجوانوں کا کیریئر بنایا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کالج کی غیرنصابی سرگرمیاں بھی زوروں پر تھیں۔ ادبی مجلس میں اساتذہ اور طلبہ حصہ لیتے تھے۔ میں نے بھی مضامین لکھنے اور پڑھنے کی ابتداء یہیں سے کی تھی۔ اکثر مشاعرے ہوتے تھے جن میں حیدر آباد اور سندھ کے دوسرے شہروں سے شعراء شرکت کرتے تھے۔

ایک بار یادگار مشاعرہ کرایا گیا۔ اس میں میر، انشاء، مصحفی، حسرت اور غالب وغیرہ کا روپ دھار کر طالب علموں نے بڑی اچھی ایکٹنگ کی۔ میں اس میں مصحفی بنا تھا۔ اس مشاعرہ کی ریہرسل کئی ہفتوں ہوئی۔ ہر شعر پر داد دینے کے لئے جملے تھے۔ مگر جب اسٹیج پر پہنچے تو ہم سب ان کی ترتیب بھول گئے۔ مگر سب نے فی البدیہ داد دے کر لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمارا یہ یادگار مشاعرہ اس قدر مشہور ہوا کہ دوسری بار یہ مغربی پاکستان کے گورنر اختر حسین کی فرمائش پر ہوا۔

یہ ان سرگرمیوں کا اثر تھا کہ طالب علموں کو اس کا احساس نہیں ہوا کہ وہ شام

کے کالج میں ہونے کی وجہ سے دن کے کالجوں کے مقابلہ میں کم تر ہیں۔ غیرنصابی سرگرمیوں کی وجہ سے طالب علموں اور استادوں میں باہم رابطہ بھی رہتا تھا اور کالج کی فضا میں زندگی ہوتی تھی۔

کالج کے ان چار سالوں میں، میں نے اپنا گزارا ٹیوشنیں پڑھا کر یا ادھر ادھر ملازمتیں کر کے کیا۔ 1961ء میں سٹی کالج کی انتظامیہ کی جانب سے قائم کئے ہوئے سکول ایس کے رحیم ہائی سکول میں ملازمت میں درخواست دی۔ اس وقت اس کے ہیڈ ماسٹر سمیع صدیقی تھے۔ جب میں نے درخواست دی تو وہ کسی کا تقرر کر چکے تھے مگر درخواست دیکھ کر اس کا تقرری کا خط پھاڑ دیا اور مجھے فوراً ملازمت دے دی۔ ہائی سکول کے طالب علموں کو پڑھا کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ لوگ کالج کا مقرر ہونے کی وجہ سے مجھے جانتے تھے۔ اس لئے عزت کرتے تھے۔ بحیثیت ایک استاد کے میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر استاد صاحب علم ہو، محنت سے پڑھاتا ہو، تو طالب علم کس قدر ہی بدمعاش کیوں نہ ہوں، اس کی عزت کرتے ہیں۔ مجھے پڑھاتے چھ مہینے ہوئے تھے کہ گرمیوں کی چھٹیاں آ گئیں اور سمیع صدیقی صاحب نے مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا۔ یہ ملازمت سے نکالا جانے والا تیسرا موقع تھا۔ میں نے چھٹیوں کی تنخواہ مانگی تو انکار کر دیا۔ اس پر میں نے اپنے دوست ظفر مسعود، جن کے والد وکیل تھے، ان سے قانونی نوٹس دلوا دیا، اور دو مہینوں کی تنخواہ وصول کی۔ جب کوئی صاحب اختیار ہو تو وہ کس طرح سے مہربان ہو جاتا ہے اور پھر کس طرح سے بگڑ جاتا ہے اس سلسلہ میں، یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر میں نے اپنے تجربات سے سیکھا کچھ نہیں۔

ملازمت ختم ہونے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے ایم اے جنرل ہسٹری میں سندھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اگر میں ملازمت میں رہتا تو اسے خود سے چھوڑنا مشکل تھا۔ کیونکہ گھر کے حالات ایسے تھے کہ ملازمت ضروری تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ بعض اوقات اتفاقات انسان کے کیریئر کو بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اگر میرا خاندان حیدرآباد سندھ میں نہیں ہوتا اور ہم کسی چھوٹے شہر میں ہوتے تو میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ہاسٹل میں آ کر رہتا اور اپنی تعلیم آگے جاری رکھ سکتا۔

اس وقت سندھ یونیورسٹی پرانی عمارت میں تھی، جو کہ گھاڑی کھاتہ میں ہے۔ جنرل ہسٹری کا شعبہ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے میٹھا رام ہاسٹل میں تھا۔ تاریخ کو جنرل اور مسلم ہسٹری میں تقسیم کرنے کا کام کراچی و سندھ یونیورسٹی میں ہوا جبکہ دوسری یونیورسٹیوں میں صرف ہسٹری ہے۔ ہمارے شعبہ کے صدر ڈاکٹر احمد بشیر تھے۔ شعبہ میں دوسرے استاد ڈاکٹر یار محمد تھے۔

جنرل ہسٹری کو ایک مشکل مضمون سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس میں کم طالب علم آتے تھے۔ جبکہ مسلم ہسٹری میں بہت داخلے ہوتے تھے۔ میرے ساتھ ایم اے میں کل پانچ طلبہ تھے۔ ڈاکٹر احمد بشیر صاحب یہاں آنے سے پہلے کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ان کی شخصیت نے مجھ پر کافی اثر ڈالا۔ وہ ایک لبرل ذہن کے اور ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنے والے تھے۔ تاریخ میں ان کا نقطہ نظر سیکولر تھا۔ انہوں نے لندن یونوریسٹی سے اکبر کی مذہبی پالیسی پر پی ایچ ڈی کیا تھا۔ انگریزی، فارسی اور اردو پر انہیں عبور تھا۔ طبیعت درویشانہ تھی۔ زندگی میں ان کا صرف ایک شوق تھا۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا۔ ان کی رہائش میٹھا روم ہاسٹل ہی کے ایک حصہ میں تھی۔ زور سے بولتے تھے۔ اس لئے گھر کی آواز شعبہ تک آتی تھی۔ جب پڑھاتے تھے تو محو ہو جاتے تھے۔ ایم اے کے پہلے سال میں ہم نے ان سے یونانی تہذیب پڑھی۔ جب ان کا لیکچر شروع ہوتا تھا تو علم کا ایک سیلاب تھا کہ جو بہا چلا جاتا تھا۔ ایم اے کے دوسرے سال میں مغل تاریخ پڑھائی جو کہ ان کا اپنا مضمون تھا۔

جب میں شعبہ میں لیکچرار ہوا تو انہیں اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں ایک بڑے عالم کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جب بھی بات کرتے کسی علمی موضوع۔ لیکن علمی رعونت بالکل نہ تھی۔ اگر کبھی معلوم نہ ہوتا تو بلا تکلف پوچھ لیا کرتے تھے۔ ان کے خاص موضوعات میں تاریخ، ادب، لسانیات اور آرٹ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں نہ تو گھر بنایا نہ پلاٹ خریدا۔ ان کا مشغلہ صرف کتابیں اکٹھی کرنا تھا۔ بہت زیادہ لوگوں سے ملتے بھی نہیں تھے۔ شام کو کتابوں کی دکانوں پر جاتے تھے وہیں لوگوں سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت حیدر آباد میں کئی کتابوں کی اچھی دکانیں تھیں۔

ایجوکیشنل بک ڈپو، الائیڈ، فیروز سنز، غلام علی، آزاد بک ڈپو اور ادبیات۔ یہ سب نئی اور اچھی کتابیں منگاتے رہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری دکانیں بند ہو گئیں۔

اس وقت اساتذہ اور طلبہ کے درمیان سب سے بڑا رشتہ پڑھائی کا ہوا کرتا تھا۔ لیکن کبھی کسی طالب علم کی یہ جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ استاد سے یہ معلوم کرے کہ ان کے پاس کون سا پرچہ ہے اور اسے کتنے نمبر ملے ہیں۔ بشیر صاحب نے ایم اے کے دو پرچے دیکھے مگر ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ دو پرچے کون سے تھے۔ اس زمانہ میں حاضری کی شرط 70 فیصد ہوا کرتی تھی۔ جس کی حاضری کم ہوتی تھی۔ اس کا فارم نہیں بھیجا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم لیڈر کے ساتھ یہ ہو گیا کہ اس کی حاضری کم ہو گئی۔ بشیر صاحب نے فارم بھیجنے سے انکار کر دیا۔ وائس چانسلر نے بلا کر سفارش کی تو کہنے لگے کہ آپ لکھ کر دے دیجئے میں حکم کی تعمیل کروں گا۔ اور کئی اساتذہ نے سفارش کی، مگر یہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر اس کا فارم بھیج دیا تو اس سے پہلے جن طالب علموں کے فارم اسی اصول پر نہیں بھیجے گئے۔ تو ان کے لئے کیا جواب ہو گا؟ اس طالب علم لیڈر کا فارم تو نہیں گیا، مگر وہ جب بھی بشیر صاحب سے ملا احترام اور عزت کے ساتھ۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم اپنے گاؤں سے آیا تو ان کے لئے گھی کا ڈبہ بطور تحفہ لے آیا۔ انہوں نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ اگر تم پڑھ کر چلے جاتے اور پھر لاتے تو ضرور قبول کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ دن بھر درخت کے نیچے ڈبہ لئے بیٹھا رہا مگر انہوں نے اس کی ضد کی بھی پروا نہیں کی۔ اس طالب علم کی بھی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کو لینے میں کیا حرج ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ روایت شروع ہو چکی تھی اور کچھ اساتذہ تحفہ تحائف قبول کرنے لگے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی انکار کرے تو حیرت کی بات تھی۔ شاید طالب علم کا بھی یہ مقصد نہ ہو کہ وہ تحفہ کے ذریعہ نمبر بڑھوانا چاہتا ہو۔ وہ یہ تحفہ محض عزت کے طور پر خوشی کے لئے دینا چاہتا ہو۔ مگر بشیر صاحب کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے فیصلہ کو کہیں متاثر نہ کر دے۔

ایک مرتبہ پبلک سروس کمیشن سے سی ایس ایس کے پرچے ان کے پاس آئے۔

ایک امیدوار نے کسی طرح سے معلوم کر لیا کہ تاریخ کا پرچہ ان کے پاس ہے۔ لہٰذا وہ سفارش لے کر ان کے پاس گیا۔ اس سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا مگر بعد میں ہم سے کہنے لگے کہ "جب میرے پاس آیا تو مجھ سے پنجابی بولی کہ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی ہو جائے پھر نمبر بڑھانے کے لئے کہا۔ اس پر میں نے کہا کہ اپنا رول نمبر لکھ کر دو، میں بعد میں دیکھ لوں گا۔" بعد میں انہوں نے پبلک سروس کمیشن کو لکھا کہ ان کے ہاں سے یہ راز کس طرح افشا ہوا کہ کون سے پرچے کس کے پاس ہیں۔ کمیشن نے امیدوار کا نام معلوم کرنا چاہا۔ انہوں نے یہ بتانے سے انکار کر دیا، مگر اس امیدوار کو فیل کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ سزا کافی تھی۔

وہ ہر معاملہ میں اس کے قائل تھے کہ کوئی غلطی نہ ہو اور کام مکمل ہو۔ اس کی مثال ان کی اکبر والی کتاب ہے جو ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسس تھا۔ اسے انہوں نے سندھ یونیورسٹی پریس سے چھپوانا شروع کیا۔ اس کی ضخامت، جب یہ چھپ کر تیار ہوا ہے تو 247 صفحات ہوئے۔ اس کی اشاعت میں تقریباً سات سال لگے۔ اس دوران میں روز ان کی پریس والوں سے لڑائی ہوتی تھی۔ چھپائی کے اس عمل میں وہ پریس، چھپائی اور ٹائپ کے بارے میں ماہر ہو چکے تھے۔ بار بار پروف پڑھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ایک غلطی بھی رہے گی وہ اسے چھپوائیں گے نہیں۔ پھر بھی کتاب میں ایک غلطی رہ گئی جسے انہوں نے ہاتھ سے درست کیا۔

کتاب بیس یا پچیس کاپیاں خاص طور پر جلد کرا کے اپنے خاص دوستوں کو دیں۔ میں بھی ان لوگوں میں سے تھا کہ جسے یہ کتاب ملی۔ کتاب تو چھپ گئی مگر اب یہ مسئلہ آیا کہ اسے فروخت کیسے کیا جائے؟ بک سیلرز کمیشن بھی زیادہ مانگتے تھے اور کتابوں کی قیمت بعد از فروخت ادا کرنا چاہتے تھے۔ ان شرائط پر ان میں اور بک سیلرز میں کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ کتابوں کو آگ لگا دوں گا مگر انہیں ان شرائط پر نہیں دوں گا۔ اگرچہ انہوں نے کتابوں کو آگ تو نہیں لگائی مگر وہ کتابیں ڈبوں میں گل کر رہ گئیں اور مارکیٹ میں نہیں آ سکیں اور نہ ہی لوگوں کو ان کے اس کام کے بارے میں پتہ چل سکا۔ وہ جن اصولوں کے قائل تھے دوسروں کو بھی اس پر عمل کرتا دیکھنا چاہتے

تھے۔ مگر ایک بدعنوان معاشرے میں یہ ممکن نہیں، اس لئے ایک ایسے معاشرہ میں ایماندار اور بااصول شخص ہمیشہ ہار جاتا ہے۔

اپنے ان اصولوں کی وجہ سے ان کا کام اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ ایک مرتبہ انہوں نے بتایا کہ کراچی کے ایک پبلشر نے انہیں مغلوں کی تاریخ لکھنے کو کہا۔ ان کا ارادہ تھا کہ "مغلوں کی الف لیلہ" نام سے ایک سیریز لکھیں گے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب انہوں نے بابر پر لکھی جس کا عنوان تھا "قصہ فرغانہ کے شہزادے اور لنگڑے راجپوت کا" جب کتاب چھپ کر آئی تو اس پر لکھا تھا کہ "جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ" بس اتنا کافی تھا۔ ہمایوں پر جو کتاب لکھ رہے تھے اسے پھاڑ ڈالا اور پبلشر سے کہا کہ اب وہ اس کے لئے کچھ نہیں لکھیں گے۔

ان کی ایک اور کتاب کا قصہ دلچسپ ہے۔ واجد علی شاہ کے عہد کے پس منظر میں انہوں نے ایک خوبصورت ناولٹ لکھا: "بی جان طوائف" پہلے اس کی کتابت حیدر آباد میں کرائی، مگر پسند نہیں آئی۔ کہا کہ لاہور میں کسی اچھے کاتب سے کراؤں گا۔ لاہور میں آکر معلومات کیں تو کسی نے کہا کہ ایک امام مسجد ہیں جو اچھے کاتب ہیں لہٰذا ان کو ڈھونڈ کر کتاب دی۔ مسجد کے امام صاحب نے دو دن بعد آکر کتاب کا مسودہ واپس کرتے ہوئے کہا وہ ایسی فحش کتاب کی کتابت نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے اردو و انگریزی میں جو کچھ لکھا وہ مسودوں کی شکل ہی میں رہا۔ آخر دنوں میں جب وہ قصور میں اپنے آبائی گھر آ گئے تھے تو قصور کی ایک تاریخ لکھی تھی۔ اس کا مسودہ نہ جانے کیسے قصور کے ایک پٹھان خاندان کے پاس ہے جو نہ تو خود چھپواتے ہیں اور نہ کسی کو دیتے ہیں۔

میرے سامنے اپنے دو استادوں کی مثالیں ہیں کہ جنہوں نے لکھا مگر وہ چھپ نہیں سکا۔ ان کا کام کونوں کھدروں میں پڑا کرم خوردہ ہو چکا ہو گا یا شاید ردی میں فروخت کر دیا گیا ہو۔

ایوب خاں نے جب فرینڈز ناٹ ماسٹر لکھی یا لکھوائی تو ہماری بیوروکریسی فوراً حرکت میں آ گئی۔ یونیورسٹی میں ہدایات آئیں کہ اس کتاب کے ادبی، فلسفیانہ، سیاسی

اور تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ ریڈیو پاکستان حیدر آباد نے یہ سیریز شروع کی۔ ایک کے بعد ایک پروفیسر حضرات نے جا کر اس کتاب کی خوبیوں پر بولنا شروع کیا۔ لیکن بشیر صاحب کئی بار کہنے کے باوجود نہیں گئے۔ جو پروفیسرز گئے اور جا کر جھوٹ بولا' انہیں اس کا کوئی انعام نہیں ملا' جو نہیں گئے' ان سے کوئی بازپرس بھی نہیں ہوئی۔ اس سے سبق تو یہ ملتا ہے کہ اگر آمریت کی شروع سے مزاحمت کی جائے تو اسے کمزور کیا جا سکتا ہے یا روکا جا سکتا ہے' لیکن اگر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں تو یہ بڑھتے بڑھتے لوگوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہی ہوا۔ لوگ ایوب خاں کی آمریت سے ڈر گئے اور اس کی خوشامد و چاپلوسی میں مصروف ہو گئے۔ اس کا فائدہ آنے والے آمروں کو ہوا کہ جنہوں نے معاشرے کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خوشامدیوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ اس سے معاشرے میں افردا کا کردار بدلتا چلا گیا۔ لوگوں میں مزاحمت کے جذبات کم ہوتے چلے گئے اور خوشامد کے عوض اپنی قیمت لگا کر خود کو فروخت کیا جانے لگا۔ مزاحمت نے سمجھوتہ کی جگہ لے لی۔

جہاں خود تحقیق کے معاملہ میں احتیاط کرتے تھے۔ وہاں دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ پی ایچ ڈی کرنے والے صرف دو حضرات ہوئے۔ ایک تو فلپائن کا ڈی وی گاتھا اور دوسرے یامین صاحب جو نواب شاہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ یامین صاحب نے "سادات بارہہ" پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ بشیر صاحب نے انہیں نواب شاہ سے بلایا اور دو سال حیدر آباد میں رکھا۔ وہ روز ان سے تھیسس کا ایک حصہ سنتے اور مشورہ دیتے تھے۔ کئی بار دونوں میں سخت لڑائی ہوئی' یامین صاحب کاغذات اٹھا کر غصہ میں چلے جاتے تھے کہ اب وہ دوبارہ سے نہیں آئیں گے۔ مگر جب مقالہ تیار ہوا تو اس کا معیار کسی باہر کی یونیورسٹی سے کم نہ تھا۔

1974ء میں جب میں کچھ دنوں کے لئے آیا تو پتہ چلا کہ بھٹو کی حکومت نے جن لوگوں کو ملازمت سے نکالا تھا ان میں یونیورسٹی کے کئی اساتذہ تھے۔ ان اساتذہ میں بشیر صاحب بھی تھے۔ یہ سن کر ایک دھچکا لگا۔ بشیر صاحب کی شخصیت یونیورسٹی میں قطعی متنازعہ نہیں تھی۔ وہ صرف پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لیتے

تھے۔ انہیں کس بات کی سزا ملی۔ ان کے علم کی یا ان کی درویشی کی ایک ایسے شخص نے جس نے کچھ پس انداز نہیں کیا ہو۔ جس کے پاس نہ دولت ہو اور نہ جائیداد' جب اسے کھانے پینے سے محروم کر دیا جائے تو اس پر کیا بیتے گی۔ مگر میں جب ان سے ملا ہوں تو وہ مطمئن تھے۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ان کے معمولات اسی طرح سے تھے۔ میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے موضوع پر بات کی۔ انہوں نے بہت مشورے دیئے جن کی وجہ سے اس موضوع پر لکھنا میرے لئے آسان ہو گیا۔

میں جب تک جرمنی میں رہا' ان سے خط و کتابت رہی۔ اس عرصہ میں ان کے بچے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ بڑا لڑکا آرمی میں میڈیکل سروس میں تھا۔ ان کی زندگی میں جو بحران آیا تھا وہ اس سے گزر گئے تھے۔ مگر پھر ایک ایسا حادثہ ہوا کہ جس نے ان کی زندگی کو بدل دیا۔ 1978ء میں ان کا لڑکا جو آرمی میں ڈاکٹر تھا' وہ ایک حادثہ میں فوت ہو گیا۔ یہ خبر سن کر وہ گھر والوں کے ساتھ فوراً قصور چلے گئے۔ چند مہینوں کے بعد وہ واپس حیدر آباد آئے۔ اب ان کے لئے حیدر آباد میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ میں جب ان سے ملنے گیا ہوں' تو وہ اپنی کتابیں کارٹنوں میں بند کرا کے ان پر لوہے کی پتریاں لگوا رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ مطمئن تھے جیسے کہ انہوں نے صدمہ کو سہہ لیا ہو۔ مگر اندر سے وہ ٹوٹ گئے تھے۔ حیدر آباد سے منتقل ہو کر وہ قصور میں اپنے آبائی گھر چلے گئے۔

قصور میں' میں ان سے ملنے کے لئے ایک بار گیا۔ ان کا گھر بازار صرافاں چینیا والی گلی میں تھا۔ بازار میں لوگوں سے پتہ پوچھا تو فوراً کسی نے بتا دیا۔ اس علاقہ میں لوگ ان سے واقف تھے۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ وہ انتہائی کمزور ہو چکے تھے۔ کچھ مہینے ہوئے کہ ان کی بیوی انتقال کر چکی تھیں۔ دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسرا لڑکا امریکہ میں تھا۔ اب وہ سب سے چھوٹے لڑکے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اس عرصہ میں ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ زندگی کا آخری سہارا ان کی بینائی تھی کہ جو انہیں زندہ رکھے ہوئے تھی۔ میں نے وہ کمرہ دیکھا جہاں الماریوں میں ترتیب سے کتابیں رکھیں تھیں۔ کہنے لگے کہ اس کمرے

میں انہوں نے ان کتابوں کے سہارے قصور میں سات سال گزار دیئے۔ قصور میں ان کے رشتہ دار تو تھے مگر دوست و احباب نہیں۔ وہ انتہائی تنہائی کا شکار تھے۔ ایک ایک کرکے ان کے تمام سہارے چھوٹ چکے تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا' صرف پڑھا۔

میں جب ان سے رخصت ہوا ہوں' تو رنج و غم سے میرا دل بھرا ہوا تھا۔ انہیں اس حالت میں دوبارہ سے دیکھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔ چلتے ہوئے انہوں نے قصور کی خاص مٹھائی میرے ساتھ کی۔

اس عرصہ میں' میں جو کچھ لکھتا تھا انہیں بھیجتا تھا۔ میرے لئے ان کی رائے بڑی اہم ہوا کرتی تھی۔ وہ میرے نظریات سے متفق نہیں تھے۔ مگر جہاں ہوتا تعریف کرتے اور جہاں اختلاف ہوتا تنقید۔

جب میں سندھ یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور میں آیا تو یہ ابتدائی زمانہ میرے لئے پریشانی کا تھا۔ میں ان سے ملنے قصور نہ جا سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ میں انہیں اس حالت میں دیکھوں۔ آخر میں ان کی بینائی بالکل ختم ہو گئی تھی اور وہ کسی اور سے خط لکھوایا کرتے تھے۔ فروری 1991ء کا مہینہ تھا کہ ایک دن ان کی لڑکی کا خط ملا کہ بشیر صاحب کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا اور انہیں ان کی والدہ کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔ خط پڑھ کر میں خاموشی و اداس کے ساتھ ایک طرف جا بیٹھا۔ ان کے ساتھ گزرے ہوئے تمام لمحات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ ایمانداری' سادگی اور علمیت کا اس طرح سے بے قدر ہو کر جانا' اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مجھے ان سے آخری ملاقات یاد آئی۔ وہ دروازے تک چھوڑنے آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگلی بار آؤں تو ان کے ساتھ کچھ دن ٹھہروں۔ شاید وہ بات چیت کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہوں۔ مگر دوبارہ سے یہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد ایک بار اور قصور جانا ہوا۔ اس بار یہ شہر مجھے اداس و خاموش نظر آیا۔ جیسے کہ یہاں میرا کچھ تھا کہ جو کھو گیا۔

ہمارے دوسرے استاد احمد بشیر صاحب کے بالکل برعکس تھے۔ ڈاکٹر یار محمد جو

اگرچہ لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی تھے مگر یہ ان لوگوں میں سے تھے کہ جنہیں علم سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ کیوں اس پیشہ میں آ گئے تھے۔ جب کسی شخص کے پاس پیشہ ورانہ صلاحیتیں نہ ہوں تو اپنا رعب جمانے کے لئے اور اپنی شخصیت ابھارنے کے لئے وہ دوسرے حربے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا سردی ہو یا گرمی یہ ہمیشہ تھری پیس سوٹ میں رہتے تھے۔ ہر وقت اکڑے رہتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرتے۔ شام کو تھری پیس سوٹ پہن کر بغل میں چھڑی داب کر تفریح کرنے جاتے تھے۔ خود ریڈر ہو کر آئے تھے اس لئے جونیئر سٹاف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہ سب دکھاوا تھا، اندر سے کھوکھلے تھے۔ بعد میں سندھ یونیورسٹی چھوڑ کر پنجاب یونیورسٹی آ گئے اور خوب ترقی کی۔ صدر شعبہ اور ڈین آف فیکلٹی رہے۔ تعجب یہ ہے کہ وائس چانسلر کیوں نہ بنے۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے ایم اے کے تھیسس بھجوائے۔ چونکہ وہ مجھے اپنا شاگرد کہتے تھے اس لئے خیال کرتے تھے کہ میں ان کی ہر بات مانوں گا۔ جب امیدواروں کا زبانی امتحان ہوا، تو مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علموں کو فرسٹ ڈویژن کے نمبر نہ دوں، انہیں کی زبان میں "ان کو رگڑ دو۔"

میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ان کی پوری زندگی پڑھاتے گزری مگر تعلیم و طالب علموں کے بارے میں ان کی یہ رائے تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے داؤد صاحب اور احمد بشیر صاحب کم ہوتے چلے گئے اور ڈاکٹر یار محمد بڑھتے چلے گئے۔

1961ء میں، میں جب سندھ یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم آیا تو اس وقت سائنس کے کچھ شعبے جام شورو میں نیو کیمپس میں منتقل ہو چکے تھے۔ اولڈ کیمپس میں آرٹ کے تمام شعبے اور کچھ سائنس کے شعبے تھے۔ ابتداء میں آرٹس کے تمام مضامین کی کلاسیں دوپہر تین بجے سے شروع ہوتی تھیں تاکہ جو لوگ ملازم ہیں انہیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جائے لیکن بعد میں کچھ شعبہ تو شام کے لئے مگر کچھ صبح میں ہوئے۔ ان میں جنرل ہسٹری کا شعبہ بھی تھا اس لئے اب ملازمت کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں، میں نے ٹیوشنیں پڑھا کر کام چلایا۔

یونیورسٹی کی زندگی تھی دلکش، ثقافتی اور غیرنصابی سرگرمیاں خوب ہوتی تھیں یونین کے الیکشن، مباحثے، ڈرامے اور موسیقی کے پروگرام، کھیل کود، یونیورسٹی کی کنٹین اس جگہ تھی جہاں صبح سے شام تک مجمع لگا رہتا تھا۔ ملنے ملانے سے لے کر لڑائی جھگڑے اور سیاست، سب کا مرکز کنٹین ہی ہوا کرتی تھی۔

اس وقت طالب علموں میں لودھی صاحب بڑے مشہور تھے۔ ان کا اصلی نام تو شاید کسی کو معلوم نہ ہو، مگر لودھی صاحب معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت حیدر آباد شہر میں صرف ایک ہی تھے کہ جنہیں پوری طالب علموں کی کمیونٹی جانتی تھی۔ یہ ہاکی کے کھلاڑی تھے اور کھیلوں کے علاوہ سیاست سے بھی ان کو شوق تھا۔ ان کی شہرت اس وقت ہو گئی تھی جبکہ وہ گورنمنٹ کالج حیدر آباد میں پڑھتے تھے۔ ان کا ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک مرتبہ جب ہاکی ٹیم کی لسٹ لگی تو جان بوجھ کر ان کا نام اس لسٹ میں شامل نہیں کیا گیا۔ لسٹ میں اپنا نام نہ دیکھ کر لودھی صاحب کو سخت غصہ آیا۔ دوپہر کو جبکہ کلاسیں ختم ہو گئیں اور بیشتر طالب علم کالج سے چلے گئے تو یہ یونین آفس پہنچے جہاں یونین کا جنرل سیکرٹری بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے جیب سے چاقو نکالا اور کھٹاک سے میز پر گاڑتے ہوئے اس سے کہا "بتا، تیری آخری خواہش کیا ہے؟" بے چارہ جنرل سیکرٹری لودھی صاحب کے تیور دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ لودھی صاحب اس کی آخری خواہش پوری کرنے پر تیار ہیں۔ ان سے درخواست کی کہ اسے پانی کا ایک گلاس لا دیں۔ لودھی صاحب چاقو کو میز پر گڑا چھوڑ کر، کنٹین آئے اور پانی کا گلاس لے کر واپس پہنچے۔ اس وقت چاقو سیکرٹری کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے لودھی صاحب کو دیکھ کر کہا کہ بتاؤ اب تمہاری آخری خواہش کیا ہے۔ اس پر لودھی صاحب سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ "یہ نہیں چلے گا۔ یہ بے ایمانی ہے۔"

ایک مرتبہ یونیورسٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو صرف گیارہ ووٹ ملے لیکن ہر ایک ان سے کہتا یہی تھا کہ اس کا ووٹ لودھی صاحب کے لئے تھا۔ اس پر کہنے لگے کہ میں گیارہ تک پر تو یقین کر لوں گا اگر بارہویں آدمی نے کہا کہ اس نے مجھے ووٹ دیا ہے تو میں چاقو مار دوں گا۔

پڑھنے لکھنے اور امتحان پاس کرنے کے معاملے میں انہیں جلدی نہیں تھی اس لئے فیل ہوتے ہوتے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ مسلم ہسٹری میں ایم اے کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ انڈیا سے کوئی اسکالر آیا۔ ہم سب سلطان ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے لودھی صاحب سے کہا کہ آپ ہسٹری کے طالب علم ہیں، مجھے آپ سے کچھ معلومات چاہئیں۔ لودھی صاحب نے فوراً اس کی توقعات کا خاتمہ کر دیا، کہنے لگے کہ:

"اپن تو گولڈن ہسٹری پڑھ کر امتحان دیتے ہیں یہ باتیں کسی اور سے پوچھو۔"

وہ بیراج کالونی میں ایک کوارٹر میں رہتے تھے کہ جہاں ان کی کل کائنات ایک پلنگ اور چند کپڑے تھے۔ اس لئے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کسی چور کو وہاں جانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ کھانا وہ مختلف جھونپڑا ہوٹلوں میں کھاتے تھے۔ مگر جب پیسے آتے تو سب کا قرضہ اتار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے بھائی نے انہیں سوٹ کا کپڑا بھیج دیا۔ انہوں نے سوٹ سلنے کو تو دے دیا مگر اتنے پیسے نہیں ہوئے کہ اسے وہاں سے اٹھاتے۔ جب درزی نے زیادہ تقاضا کیا تو کہا کہ یہ سوٹ لے لو اور اس کے عوض پیسے دے دو۔ یہ پیسے ملے تو بہت خوش تھے کہ دینے کے بجائے انہوں نے درزی سے پیسے لے لئے۔

1962ء میں، میں نے ایم اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد مجھے جامعہ عربیہ کالج میں پارٹ ٹائم ملازمت مل گئی۔ یہاں میں فرسٹ ایئر اور انٹر کے طالب علموں کو تاریخ اور اردو پڑھایا کرتا تھا۔ اگرچہ طالب علم تو کم تھے، مگر کالج کا ماحول اچھا تھا۔ اس ملازمت کی وجہ سے میری مالی حالت ٹھیک ہو گئی۔ جب 1963ء میں ایم اے کا رزلٹ آیا تو اس میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ یونیورسٹی میں ملازمت کا ملنا مشکل نظر آتا تھا۔ بہرحال میں نے ایک درخواست وائس چانسلر کے نام بذریعہ ڈاک بھیج دی۔ اسی دوران جامعہ عربیہ کالج میں میرا فل ٹائم تقرر ہو گیا۔ اس وقت رضی الدین صدیقی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے ایک اصول بنایا تھا کہ اگر شعبہ میں جگہ ہوتی تو جس کی اول یا دوم پوزیشن آئے، اسے وہاں بطور جونیئر لیکچرار رکھ لیا جائے۔ ابھی مجھے جامعہ عربیہ میں ملازمت کرتے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ

سندھ یونیورسٹی سے میرے نام انٹرویو کا خط آیا۔ وائس چانسلر نے انٹرویو کیا۔ بحیثیت طالب علم کے وہ مجھ سے تھوڑے بہت آشنا تھے اس لئے کہنے لگے کہ ایک تو کنٹین میں بیٹھنا چھوڑ دو، دوسرے طالب علموں کو میرے خلاف مت بھڑکانا۔ یوں میں یونیورسٹی میں جونیئر لیکچرار ہو گیا۔

یونیورسٹی میں ایم اے کے ساتھ ساتھ بی اے آنرز کی کلاسیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا ابتداء میں یہی کلاسیں مجھے ملیں۔ یہ زمانہ محنت کرنے میں گزرا۔ میں ہمیشہ پوری تیاری کر کے کلاس میں جاتا تھا۔ اس وجہ سے پڑھانے میں مزہ آتا تھا۔ طالب علم بھی اچھے تھے اور کلاس میں بحث و مباحثہ کرتے تھے۔

بشیر صاحب بحیثیت صدر شعبہ کے اچھے ثابت ہوئے۔ انہوں نے کبھی بھی میرے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ انہیں کوئی محفل سجانے کا شوق نہیں تھا۔ ہاں جب بھی شعبہ کے استاد مل کر بیٹھتے، بشیر صاحب علمی موضوعات پر بحث کرتے۔ اس عرصہ میں میری بڑی خواہش تھی کہ مجھے کوئی وظیفہ مل جائے تو میں پی ایچ ڈی کر آؤں مگر ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اس دوران اس بات کا احساس ہوا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں اپنے اسٹیٹس کا بڑا خیال تھا۔ میں چونکہ جونیئر لیکچرار تھا اس لئے سینئر اساتذہ ہماری کوئی عزت نہیں کرتے تھے۔ اکثر سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ رضی الدین صدیقی، جو اس وقت وائس چانسلر تھے ان کا دستور تھا کہ پروفیسر سے پورا ہاتھ ملا کر مصافحہ کرتے تھے۔ ریڈر سے آدھے ہاتھ سے، اور جونیئر لیکچرار سے بالکل نہیں۔ جب میں طالب علم تھا اور ان کے آفس میں ان سے ملنے جاتا تھا تو ان سے فوراً ملاقات کرا دی جاتی تھی۔ استاد ہونے کے بعد کسی کام سے جانا ہوا تو ان کے پی اے نے کہا، انتظار کرو، اگر فرصت ہوئی تو ملاقات ہو جائے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بحیثیت طالب علم کے میری عزت زیادہ تھی جبکہ اس وقت طالب علم مار دھاڑ نہیں کرتے تھے۔

رضی الدین صاحب کے زمانہ ہی میں بیوروکریسی کا زور بڑھ گیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے یہ سرکلر نکالا کہ سالانہ اضافہ کے وقت پر استاد کو ان کے سامنے پیش ہونا پڑے

گا۔ اس وقت جی دار لوگ بھی تھے۔ سندھی کے پروفیسر جتوئی نے سرکلر پر ہی یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وی سی نے اپنا آرڈر واپس لے لیا۔ اگر معاشرہ میں آمرانہ اقدامات کے خلاف مزاحمت ہو' تو ان کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر ان کے سامنے سر جھکا دیا جائے اور انہیں مصلحت کے ساتھ قبول کر لیا جائے تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ گرتا چلا جاتا ہے اور جبروتشدد اس پر قابو پاتا چلا جاتا ہے۔

چونکہ اس وقت ملک میں آمریت تھی۔ ایوب خاں نے تمام مخالفتوں کو ختم کر دیا تھا اور تمام موقع پرست ایوب خاں کے درباری ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ سے معاشرے کے تعلیمی اداروں میں بھی آمریت آ گئی تھی۔ سندھ یونیورسٹی میں وی سی نے اس صورتحال سے پورا فائدہ اٹھایا اور طالب علموں کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں لگا دیں۔ یونین کا جنرل سیکرٹری قاضی فضل حق' جو سیاسی طور پر سرگرم تھا' اسے یونیورسٹی سے نکال دیا اور اس کی جگہ ایک اور امیدوار جسے الیکشن میں صرف تیں ووٹ ملے تھے جنرل سیکرٹری بنا دیا۔ اس پر نہ تو طالب علموں کی جانب سے کوئی احتجاج ہوا اور نہ استادوں کی جانب سے۔ لہٰذا جب ایوب خاں نے تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی یونین پر پابندی لگائی تو سب نے اس فیصلہ کو خاموشی سے قبول کر لیا۔ آمریت کی ایک بدترین روایت یہ رہی ہے کہ اظہار رائے اور سیاسی سرگرمیوں کو ختم کر کے تشدد سے مخالفت کے تمام خیالات کو کچل دیا جائے۔ یونین پر اس پابندی کی وجہ سے تعلیمی اداروں کا ماحول یکسر بدل گیا۔ وہ تمام سرگرمیاں اور ہمہ ہمی یکدم ختم ہو گئیں اور اس کی جگہ خاموشی نے لے لی۔ طالب علموں اور استادوں کو خوف زدہ کرنے کا یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ پھر ختم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا ہی رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صبح جب یونیورسٹی پہنچا تو دیکھا کہ تمام دروازے بند ہیں اور وہاں پولیس و رینجرز کا پہرہ

ہے۔ پتہ چلا کہ رات کو ہاسٹلوں پر چھاپہ مارا گیا تھا۔ اساتذہ کے ہاسٹل پر بھی۔ آمروں کا خیال ہے کہ اگر لوگوں کو خوف زدہ کر دیا جائے تو ان پر حکومت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایوب خاں اور ان جیسے دوسرے آمر حکومت تو کر لیتے ہیں مگر معاشرے کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اب تعلیمی اداروں سے مباحثے' ڈرامے' موسیقی کی محفلیں' ادبی انجمن یہ سب ہی ختم ہو گئیں۔ ان اداروں کی فضا بوجھل اور مایوس کن ہو گئی۔ تعلیمی اداروں پر یہ ایک ایسی ضرب تھی کہ اس کی مار سے یہ ادارے آج تک نہیں سنبھل سکے ہیں۔

جب میں نے پڑھانا شروع کیا ہے تو اس وقت جنرل ہسٹری میں کم ہی طالب علم ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب طالب علموں میں یہ خیال زور پکڑ گیا تھا کہ ایسے مضامین میں داخلہ لینا چاہیے کہ جہاں آسانی سے پاس ہو جائیں۔ انہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ کون کون سے مضامین ملازمت کے لئے بہتر ہیں۔ نہ یہ کہ خود ان کی دلچسپی کیا ہے؟ اکثر طالب علم محض ڈگری کے خواہش مند تھے۔ چاہے اس ڈگری کی مارکیٹ میں کوئی قدر ہو یا نہ ہو۔ طالب علموں کی اس نفسیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ شعبوں نے اس پالیسی کو اختیار کر لیا تھا کہ طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ نمبر دے کر پاس کیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کا شعبہ برقرار رہے اور ان کی ملازمت محفوظ رہے۔ لہٰذا ان شعبوں میں طالب علموں کی اکثریت داخلہ لے کر امتحان تو پاس کر لیتی تھی مگر یہ ڈگریاں ان کے لئے محض سجاوٹ کا کام دیتی تھیں۔ جنرل ہسٹری کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ یہاں نمبر کم ملتے ہیں' اس لئے کم طالب علم یہاں داخل ہوتے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی یہ سوال بھی آ جاتا تھا کہ اگر طالب علم ہی نہ ہوں تو شعبہ کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے ہمارے شعبہ میں چار سے زیادہ اساتذہ کبھی نہیں رہے۔

1963ء سے لے کر 1970ء کا زمانہ میرے لئے اس لئے اہم رہا کہ اس دوران میں نے نہ صرف تاریخ پڑھی' بلکہ ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ تاریخ اور ادب کے اس مطالعہ سے ہی مجھ میں تاریخ کا شعور پیدا ہوا۔ آج جب رات کی خاموشی میں لیٹا ہوا

میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں، تو ان لمحات کی خوشی و مسرت کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" سردیوں میں پڑھی تھی۔ رات کی خاموشی اور چاند کی ٹھنڈی روشنی کے ماحول میں اس ناول کو پڑھتے ہوئے میرے تخیلات مجھے کہیں کا کہیں لے جاتے تھے۔ دوستوفسکی کی "کرائم اینڈ پنشمنٹ" اور برادرز کرامازوف نے ذہن پر گہرے اثرات ڈالے۔ ان ناولوں کے ذریعے مجھے انسان کے دکھ کا احساس ہوا۔ اس لئے میں نے جب بھی تاریخ پڑھی تو اس میں مجھے ان ناول نگاروں کے احساسات و جذبات گہرائی میں نظر آئے۔

کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ کتابوں کا مالک بھی ہو۔ اس لئے میں نے کتابیں خریدنا شروع کر دیں اور اپنا جیب خرچ کتابوں پر ہی خرچ کرتا تھا۔ اس وقت پنگوئن کی کتاب پانچ روپیہ میں آتی تھی۔ مارکیٹ میں کتابوں کی کمی نہ تھی۔ انگلستان، امریکہ اور ہندوستان سے خوب کتابیں آتی تھیں لہٰذا میرے پاس اکثر کتابیں اسی دور کی ہیں جن میں یورپ کے تمام کلاسیکل ناولز ہیں۔ اکثر جب بھی کراچی جانا ہوتا تو میں وہاں سے بھی کتابیں ہی خرید کر لاتا تھا۔ آج بھی نئی کتاب کی خوشبو مسرت کے احساسات کو پیدا کرتی ہے۔

یونیورسٹی کے ان ابتدائی دنوں ہی میں، یعنی 1960ء کی دہائی میں، میں نے اور شعبہ جغرافیہ میں ہمارے دوست ظفر حسن شاہ اور شعبہ فلسفہ کے دوست فرید الدین نے سوچا کہ یونیورسٹی میں ایک ایسا کلب بنایا جائے جہاں ہم علمی و ادبی بحث و مباحثہ کریں، اپنے مضامین و مقالات پیش کریں اور جو باہر سے صاحب علم آتے ہیں انہیں بلا کر ان سے کچھ سنیں۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جن اساتذہ کو علم و ادب سے شوق تھا۔ ہم ان سے رابطہ کیا، ان میں ڈاکٹر احمد بشیر، احسن فاروقی، جمیل واسطی (شعبہ انگریزی)، حضور احمد سلیم (شعبہ فارسی) اور ضیاء الدین (شعبہ اردو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابتداء میں یہ نشستیں ہمارے شعبہ ہی میں ہوتی تھیں مگر بعد میں اس خیال سے کہ یونیورسٹی کو ان علمی محفلوں پر اعتراض نہ ہو، ہم نے برابر کی ایک عمارت میں جہاں کوآپریٹو بینک تھا، وہاں ان محفلوں کو منتقل کر دیا۔ یہ نشستیں ہر بدھ کو شام کو ہوا کرتی

تھیں۔ ان میں اکثر شہر کے کچھ لوگ بھی آ جاتے تھے۔ ان میں ریڈیو پاکستان کے الیاس عشقی قابل ذکر تھے۔ اکثر ان حضرات سے کہ جنہوں نے آرٹس کے کسی مضمون میں پی ایچ ڈی کیا ہوتا ان سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے مقابلے کا مقدمہ پیش کریں۔

کبھی کبھی صورتحال دلچسپ ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ہمارے دوست ضیاء الدین نے جو بعد میں گورنمنٹ کالج میں اردو کے پروفیسر ہوئے' انہوں نے ایک افسانہ پڑھا۔ جب وہ پڑھ رہے تھے تو احمد بشیر صاحب بڑے غور سے سن رہے تھے۔ جب افسانہ ختم ہوا تو ضیاء نے بڑے فخر سے داد و تحسین کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ اس پر بشیر صاحب نے کہا کہ : "1963ء میں' میں نے فٹ پاتھ سے ایک رسالہ خریدا تھا جس کے ٹائٹل پر دو لڑتے ہوئے مرغوں کی تصویر تھی اس رسالہ میں' میں نے یہ افسانہ پڑھا تھا۔ کیا تم نے وہیں سے لیا ہے؟" ابتداء میں تو ضیاد نے انکار کیا اور کہا کہ یہ اس کا تخلیق کردہ افسانہ ہے' مگر بعد میں تسلیم کر لیا کہ یہ پلاٹ اس نے ایک انگریزی افسانہ سے لیا ہے۔

اس کلب کے ایک ممبر ڈاکٹر احسن فاروقی بھی تھے۔ یہ کسی زمانہ میں سندھ یونیورسٹی میں رہے تھے۔ مگر بعد میں کسی وجہ سے نکال دیئے گئے تھے۔ پھر یہ کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ مگر وہاں وائس چانسلر سے نہ بنی۔ ایک عرصہ تک بے کار رہے۔ کہتے تھے کہ اس بیروزگاری کے زمانہ میں سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا تھا کہ کراچی کی گلیوں میں سائیکل چلاتا رہتا تھا۔ بعد میں کسی کی سفارش پر دوبارہ سندھ یونیورسٹی میں آئے۔ ان کو بحیثیت لیکچرار کے رکھا' جبکہ شعبہ میں ان کے شاگرد پروفیسر تھے۔ مگر بیروزگاری انسان کو مجبور کر دیتی ہے' اپنی قابلیت اور شہرت کے باوجود انہوں نے اس حیثیت میں کام کرنا منظور کر لیا۔ وہ یونیورسٹی میں ٹیچرز ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ان کے دو ہی مشغلے تھے' لکھتے تھے یا پڑھتے تھے۔ کہتے تھے کہ لکھتا اس لئے ہوں تاکہ ذہنی تناؤ کم ہو جائے۔ اپنی ساری تلخی اپنے افسانوں میں نکال دیتے تھے۔ روز ایک افسانہ لکھتے تھے۔ جس سے ناراض ہوتے دوسرے دن اس کا خاکہ تیار ہوتا تھا۔ پھر اس کے سامنے اسے سنا بھی دیتے تھے۔

ہماری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ ہم کچھ دوستوں نے ان سے فرنچ پڑھنا شروع کر دی تھی جسے وہ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ جب بھی ان کے کمرے میں جانا ہوتا تو لکھنے یا پڑھنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ باتیں کرتے جاتے تھے اور سروتے سے چھالیہ کاٹتے جاتے تھے۔ منہ میں ہر وقت پان رہتا تھا۔ غضب کا حافظہ تھا۔ کسی ناول کے بارے میں پوچھ لیتے تو اس کو شروع سے آخر تک سنا دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ سارا یورپی لٹریچر پڑھ لیا ہے۔ اب دوبارہ سے پڑھ رہا ہوں۔

کراچی یونیورسٹی سے انہیں نکلوانے میں وہاں کے بہاری گروپ کا ہاتھ تھا اس لئے بہاریوں کے سخت خلاف تھے۔ ایک بار گوتم بدھ کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ "ہاں آدمی اچھا تھا' مگر تھا بہاری۔" کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہاشمی تھے جنہوں نے انہیں نکالا تھا۔ ایک بار اس کی سخت برائی کر رہے تھے۔ ہمارے دوست فرید الدین نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اب تو وہ مر چکے ہیں۔ انہیں معاف کر دیجئے۔ ایک دم بگڑ کر بولے: "میاں اسی طرح سے معاف کرتے رہے تو تاریخ کیسے بنے گی۔"

ہماری نشستوں ہی میں انہوں نے اپنی یادداشتیں سنائیں۔ اس کا بڑا اچھا عنوان تھا: "جاتی دنیا دیکھی" عطاء الرحیم صاحب' جو فلسفہ کے استاد تھے' انہیں مشورہ دیا کہ اس کے بجائے "دل کے آئینہ" میں عنوان رکھ لیں' تو ان کی بات مان لی۔ اکثر وہ دلچسپ حرکتیں کر جاتے تھے۔ ایک محفل میں انہیں کسی کتاب سے تبصرہ کرنا تھا۔ اس کے مصنف کے سامنے اس کی خوب تعریف کی' مگر جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اس پر تنقید کر ڈالی۔ سیدھے آدمی تھے۔ غم روزگار نے انہیں تلخ بنا دیا تھا۔ اگر فرصت ملتی اور ایک جگہ سکون سے رہتے تو اچھے استاد اور لکھاری ہوتے۔ ان کی پوری زندگی پریشانیوں میں گزری۔ سندھ یونیورسٹی کے بعد اسلامیہ کالج سکھر میں پڑھایا پھر بلوچستان یونیورسٹی چلے گئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ چونکہ آخر میں بہت لکھا' اس لئے تحریر میں گہرائی نہیں رہی تھی۔

بعد میں کلب کی نشستیں دیال داس کلب میں ہونے لگیں تھیں۔ یہ اولڈ کیمپس کے پاس ایک پرانی عمارت میں تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کلب کی بڑی شہرت

تھی۔ یہاں ڈرامے اور ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ تقسیم کے بعد یہ محض جوئے کا اڈہ بن کر رہ گیا تھا۔ جب جبرئیل صدیقی اس کے سیکرٹری ہوئے تو انہوں نے کوشش کی کہ یہاں ادبی محفلیں بھی ہو جائیں۔ انہیں کی وجہ سے ہمیں یہاں جگہ مل گئی تھی۔ اس جگہ میں نے "تاریخ کے نظریات" پر مضامین سنائے تھے۔ جب میں 1970ء میں یورپ گیا ہوں تو اس کلب کی نشستیں باقاعدہ سے ہوتی تھیں مگر بعد میں یہ آہستہ آہستہ کرکے ختم ہو گئیں۔

1963ء سے 1970ء تک یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے سات سال ہو گئے تھے۔ اس دوران کئی بار وظیفے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک بار مجھے اسپین کا وظیفہ مل بھی گیا مگر اس وقت کے وائس چانسلر حسن علی عبدالرحمان نے چھٹی دینے سے انکار کر دیا۔ جب غلام مصطفیٰ شاہ وائس چانسلر ہو کر آئے تو انہوں نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا یونیورسٹی اولڈ کیمپس کو راتوں رات خالی کرکے نیو کیمپس لے گئے۔ اس طرح اچانک کیمپس شفٹ ہونے سے سب کو تکلیف ہوئی کیونکہ حیدر آباد اور جام شورو کے درمیان ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام نہیں تھا۔ گورنمنٹ کی ایک بس تھی جو شاف کے لئے تھی، مگر یہ بھی خراب ہونے کی وجہ سے کبھی آتی تھی اور کبھی نہیں۔ استادوں سے زیادہ تکلیف طالب علموں کو تھی۔

غلام مصطفیٰ شاہ نے آتے ہی یونیورسٹی کے ڈھانچہ کو بدلا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے سندھی اور اردو بولنے والے اساتذہ کی علیحدہ علیحدہ میٹنگیں بلوائیں اور یوں اساتذہ میں شناخت کے احساس کو پیدا کیا۔ چونکہ اس وقت اساتذہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے انہوں نے فوراً ہر شعبہ میں سندھی اساتذہ کا تقرر کرکے ان کی تعداد بڑھا دی۔ ظاہر ہے کہ ان جلد بازی کی تقرریوں میں صلاحیت و قابلیت کا معیار برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ نااہل اور سفارشیوں کا تقرر ہوا جس کی وجہ سے تعلیم کا معیار اچانک گر گیا۔ بہت عرصہ بعد جب کہ مصطفیٰ شاہ وی سی نہیں تھے تو انہوں نے ادبیات نامی کتابوں کی دکان پر بیٹھے ہوئے شکایت کی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اب لکھنا و پڑھنا دونوں نہیں جانتے ہیں۔ اس پر ظفر حسن شاہ

نے کہا کہ ”شاہ صاحب ان میں سے اکثریت آپ ہی کی رکھی ہوئی ہے۔“ قوم پرستی کے جذبات میں اگر انتہا پسندی آ جائے تو اس کے اثرات معاشرے پر مہلک ہوتے ہیں۔

دوسرا قدم جو مصطفیٰ شاہ نے اٹھایا وہ یہ کہ 25 یا 26 وظیفے دیئے۔ ان میں بھی ان کی اپنی پسند شامل تھی۔ مجھے اس وقت بھی کوئی وظیفہ نہیں ملا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ یا تو اس وقت میں بھی پڑھنے چلا جاؤں، یا پھر پی ایچ ڈی کا خیال ذہن سے نکال کر اس طرح سے بقایا وقت گزار دوں۔ میں نے انگلستان کی کچھ یونیورسٹیوں کو داخلہ کے لئے لکھا۔ لندن یونیورسٹی میں کوئین میری کالج میں میرا داخلہ ہو گیا۔

حیدر آباد میں اس وقت تلک چاڑی پر برٹش کونسل ہوتی تھی جس کے لائبریرین امتنان بخاری صاحب ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اس لائبریری کو شروع کیا تھا۔ وہ بڑے ہمدرد، مہذب اور شریف طبیعت کے مالک ہیں، ان سے میرا تعلق طالب علمی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ برٹش کونسل کی جانب سے مجھے سفر کے اخراجات مل جائیں اور فیس کا بندوبست ہو جائے۔ انہوں نے برٹش کونسل کراچی کے ڈائریکٹر سے ملاقات کرائی۔ اس نے وعدہ کیا کہ میں یونیورسٹی کی معرفت درخواست دوں تو وہ میرے لئے یہ دونوں کام کرا دے گا۔ افسوس کہ یونیورسٹی نے میری درخواست آگے نہیں بھجوائی۔ اس لئے سفر کے اخراجات کا بندوبست نہیں ہو سکا۔

مجھے یاد ہے کہ میں ظفر حسن شاہ کے ساتھ وی سی سے ملنے گیا تاکہ ان سے درخواست کی جائے کہ وہ میری ٹریول گرانٹ کے کاغذات بھجوا دیں۔ جب ان کے سامنے پیش ہوئے تو میں نے دیکھا کہ بڑی بڑی مونچھوں والی شخصیت میرے سامنے ہے، یہ وی سی سے زیادہ مجھے تھانیدار لگے۔ میں نے بڑے ادب سے اپنی بات کہی تو کڑک کر انگریزی میں ارشاد ہوا کہ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اچھا میرا پروویڈنٹ فنڈ سے میرا حصہ دے دیں تاکہ میں اسی سے سفر کے اخراجات اٹھاؤں۔ تو کہا کہ وہ سارا نہیں ملے گا۔ اس میں سے صرف 75 فیصد ملے گا۔ یہ میری اس ہستی سے پہلی ملاقات تھی کہ جو پاکستان میں

تعلیم کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ پرنسپل' ڈائریکٹر آف ایجوکیشن' وائس چانسلر اور پھر وزیر تعلیم۔ آج پاکستان میں جو تعلیم کا حال ہے' اس میں انہی جیسے لوگوں کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ جب میں انگلستان میں داخلہ کے لئے درخواست دے رہا تھا کہ ایک دن یونیورسٹی میں حامد زیدی مل گئے۔ یہ جغرافیہ میں لیکچرار تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ "لندن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے اور جانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔" میں نے ایسے ہی پوچھ لیا کہ "کیا ارادہ ہے؟ ساتھ چلو گے۔"

کہنے لگے کہ "کیسے۔"

میں نے کہا "داخلہ لے لو' ساتھ چلتے ہیں۔"

میں نے کوئین میری کالج کا پتہ دیا۔ حامد نے داخلہ کے لئے درخواست دی۔ اس کا داخلہ بھی ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم ایئرپورٹ پر گئے تو ان کے سسر نے مجھ سے کہا کہ ذرا حامد کا خیال رکھنا۔ اس وقت صورت حال کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے' میں نے بھی ایسے حامی بھری کہ میں واقعی اس کا خیال رکھوں گا۔ مگر لندن جا کر ہوا یہ کہ حامد نے میرا خیال رکھا۔ اس پر میں نے سوچا کہ حامد کے سسر کو اپنے داماد کی صلاحیتوں کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔

☆

لندن

ملک سے باہر جانے کا پہلا تجربہ۔ جہاز کا پہلا سفر، گھروالوں سے پہلی بار اتنی دوری۔ ان سب نے مل کر اعصابی طور پر نروس کر رکھا تھا۔ لندن میں میرا تو کوئی جاننے والا نہیں تھا مگر حامد کے سالے وہاں تھے۔ لہٰذا جب ہم لندن پہنچے تو وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ ایئرپورٹ پر لینے آئے ہوئے تھے۔ یہ اکتوبر کا مہینہ اور 1970ء کا سال تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ وہاں سخت سردی ہو گی سویٹر پہن رکھا تھا۔ مگر جب ایئرپورٹ پر آئے تو سخت گرمی تھی۔ چونکہ شام ہو چکی تھی اس لئے وہ ہمیں کھانا کھلانے ایک پاکستانی ہوٹل لے گئے۔ انہیں لندن میں رہتے ہوئے اس بات کا احساس نہیں تھا ہم تو پاکستانی کھانے کھاتے آ رہے ہیں اگر کوئی انگریزی کھانا کھلاتے تو وہ ہمارے لئے نئی چیز ہوتی۔ ان کے ہمراہ جو صاحب تھے وہ ڈاکٹر تھے۔ جب ہم نے کھانا شروع کیا تو انہوں نے روٹی کو ہاتھ کے بجائے چھری کانٹے سے کھایا۔ میرا یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی کو اس طرح سے روٹی کھاتے دیکھا ہو۔ پھر سوچا کہ یہ مغرب ہے اور ان کے انداز نرالے ہیں، شاید یہاں یہی دستور ہو۔

کھانے کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب ہمیں ہاسٹل میں چھوڑا جائے۔ حامد کو کناٹ ہاسٹل میں کمرہ ملا تھا جبکہ مجھے کوئین میری کالج کے ہاسٹل میں جو ساؤتھ ووڈ فورڈ میں تھا۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ رات حامد کے ہاسٹل میں گزاری جائے، اور دوسرے دن میں اپنے ہاسٹل جاؤں چونکہ اس وقت تک تمام طالب علم نہیں آئے تھے۔ اس لئے ایک رات

کے لئے مجھے کمرہ مل گیا۔

دوسرے دن اپنے ہاسٹل کی تلاش میں حامد کی ایک رشتہ دار کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہ سفر انڈر گراؤنڈ ٹیوب میں ہوا' یہ بھی پہلا تجربہ تھا۔ ایسے موقعوں پر جبکہ آپ کو کچھ معلوم نہ ہو' اور کوئی جاننے والا آپ کی رہنمائی کرے' تو آپ اس کے احسان مند ہوتے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتا ہے کہ جیسے ہم گاؤں والوں کا شہر میں کرتے ہیں۔ علم چاہے کوئی سا بھی ہو' وہ اپنی برتری قائم کر لیتا ہے۔ سیکھنے کا عمل ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ مگر جب ایک بار وہ آ جائے تو پھر اس کی حیثیت معمولی ہو جاتی ہے۔ مشرق اور مغربی کی دو دنیاؤں میں اس قدر فرق ہے کہ جب نیا نیا آدمی جاتا ہے تو اسے اپنی عادات' حرکات و سکنات' سب کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل مغرب میں اس قدر تیز ہے کہ جب بھی جاؤ' وہاں ایک اور ہی دنیا ہوتی ہے اور خود کو دوبارہ سے ہر نئی تبدیلی سے واقف ہونا پڑتا ہے۔

بہرحال' جب ساؤتھ ووڈ فورڈ کا سٹیشن آیا' اور میں ہاتھ میں اپنا اٹیچی کیس لئے اترا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے' یہاں ٹرین زیر زمین سے اوپر آ گئی تھی۔ جب ہم سٹیشن سے باہر آئے اور ادھر ادھر دیکھ کر حالات کا جائزہ لے رہے تھے کہ اچانک ایک صاحب نے آ کر اردو/ہندی میں پوچھا: "آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

پھر انہوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا "میں لاہورا سنگھ ہوں' یہ سامنے میری درزی کی دکان ہے' کپڑوں کی سلائی اور مرمت کرتا ہوں۔"

کچھ دکھی معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگے کہ یہاں کیا رکھا ہے؟ بس زندگی گزر رہی ہے۔ صبح سے شام ہوتی ہے بس۔ ان کی باتیں سن کر سوچا کہ ابھی آئے ایک ہی رات ہوئی ہے اور یہ اس قدر کرب ناک تصویر کھینچ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر گزارا کیسے ہو گا؟

یہ لاہورا سنگھ سے پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد جب تک میں اس علاقہ میں رہا ان سے آتے جاتے ملاقات ہوتی تھی۔ میں ان کی دکان پر ٹھہر جاتا تھا۔ وہ تھرموس سے

چائے نکال کر دیتے تھے اور پھر ہندوستان کی باتیں۔ ایک عرصہ سے لندن میں مقیم تھے۔ مگر خوش نہیں تھے۔ گاہک جب کپڑے لاتے اور انہیں جو پرچی دیتے وہ اردو میں ہوتی تھی۔ کہتے تھے کہ سکول میں اردو پڑھی تھی۔ اب تک اس سے کام لیتا ہوں۔

سٹیشن سے ہاسٹل زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ اس لئے سوٹ کیس کو ہاتھ میں لئے وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک کمپلیکس تھا کہ جس میں تین ہاسٹل تھے۔ مجھے مورس (Maurice) ہال میں جگہ ملی تھی۔ یہاں آ کر دیکھا تو ہاسٹل ویران تھا' چونکہ ابھی سیشن شروع نہیں ہوا تھا' اس لئے طالب علم نہیں آئے تھے۔ مجھے جو کمرہ ملا وہ 101 تھا۔

ہاسٹل کی عمارت اور اس کا ماحول اس قدر خوبصورت تھا کہ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نئی عمارت تھی' بڑے بڑے شیشے' باہر درخت اور سبزہ۔ خاموش و سکون۔ دل چاہتا تھا کہ ایک کونے میں بیٹھ جاؤں اور باہر کی خوبصورتی دیکھتا رہوں یہاں دو دن تو بڑے خراب گزرے کیونکہ کم طالب علم تھے۔ مگر جب کالج کھلا تو ہاسٹل بھر گیا۔

ابتداء میں تو انگریزی کھانا عجب لگا۔ پیٹ ہی نہیں بھرتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد دوست بننا شروع ہوئے۔ میرے کمرے کے برابر رچرڈ لیمن رہتا تھا۔ اسے ڈک کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ بچپن میں پولیو کی وجہ سے معذور ہو گیا تھا اور وہیل چیئر پر رہتا تھا۔ حکومت کی جانب سے اسے ایک چھوٹی سی کار ملی ہوئی تھی۔ یہ انگلش ادب کا طالب علم تھا۔ اس سے بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اس نے اپنے کمرے میں بجلی کی کیتلی رکھ رکھی تھی۔ جب بھی اس کے کمرے میں جانا ہوتا' فوراً" چائے بنا کر دیتا تھا۔ اسی فلور پر ایک اور طالب علم تھا' روجر' یہ ڈک کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اسے نیچے لے جاتا۔ شام کو اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اسے تفریح کراتا۔ اس سے بھی دوستی ہو گئی۔ یہ شطرنج کا بھی شوقین تھا لہٰذا فرصت میں باتیں کرنا اور شطرنج کھیلنا ہمارا مشغلہ تھا۔

ہاسٹل میں افریقی' ترک' ایرانی' عرب اور ہندوستان طالب علم تھے۔ تاریخ میں

جارج شمعون تھا۔ یہ یہودی تھا اور اس کا خاندان مشرقی یورپ سے ہجرت کر کے انگلستان میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ بڑا ہنس مکھ اور مذاقی لڑکا تھا۔ اس کے ساتھ، ایک روز یہ پروگرام بنا کر لندن کے تاریخی مقامات دیکھنے جائیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹیوب کے کرائے بہت تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی یہ طریقہ اپنایا کہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے اور آخر میں ایک شلنگ دے کر باہر چلے جاتے تھے۔ اس بے ایمانی کی وجہ سے لندن کی سیر سستی ہو گئی۔

اسکاٹ لینڈ کا ای ین تھا، جو اسکاچ لہجہ میں انگریزی بولتا تھا تو کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔ ایک بار ٹیبل ٹینس کھیلتے ہوئے اس نے کچھ کہا، میں نے جواب میں اسے کہا کہ ہاں آج موسم اچھا ہے۔ کہنے لگا مگر میں نے تو کھانے کے بارے میں پوچھا تھا۔ کافی عرصہ ساتھ رہنے پر اس کا لہجہ ہمیں سمجھ آنے لگا تو دوسرے طالب علم مجھ سے اس کی گفتگو کا مطلب پوچھتے تھے۔ اس کو ٹینس کا شوق تھا۔ اس لئے وقت بے وقت صبح یا شام وہ نازل ہو جاتا کہ اس کے ساتھ ٹینس کھیلوں۔

بشپ نامی ایک طالب علم تھا۔ نیک، سمجھدار اور مذہبی۔ جب اس سے دوستی ہوئی تو اس کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ میں چونکہ عیسائی نہیں ہوں، اس لئے آخرت میں مغفرت نہیں ہو گی۔ اس لئے اس نے کوششیں شروع کر دیں کہ میری آخرت سدھر جائے۔ وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ چرچ لے جاتا تھا اور عبادت میں شریک کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے گھر لے گیا۔ ان کا گھر ایک چھوٹے سے قصبہ میں تھا جو سمندر کے ساحل پر واقع تھا۔ اس کے ماں باپ بڑی محبت سے ملے۔ سردیاں بڑی سخت تھیں۔ اس لئے یہ بستر کو گرم بوتلوں سے گرم کرتے تھے۔ اس کی ماں نے مجھے ایک ریڈیو بھی دیا تاکہ اتوار کی صبح میں انڈین گانے سن سکوں۔ ایک مرتبہ یہ چرچ کی ایک تقریب میں لے گئے۔ اس چرچ کے بیچ میں ایک حوض تھا کہ جس میں نئے ممبروں کو غسل دیا جاتا تھا۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں جانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہاں ہر شخص کن انکھیوں سے مجھے دیکھتا تھا۔ شاید اب تک وہاں ہم لوگ نہیں گئے تھے اس لئے میری

بڑی قدر ہوئی۔

کرسمس کے موقع پر ڈک نے گھر پر چلنے کو کہا۔ اس کا گھر لندن کے نواحی علاقہ میں تھا۔ اس تہوار پر اس کے تمام گھر والے جمع ہوئے تھے۔ سخت سردی تھی۔ رات کو جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کہ برف کی سل پر لیٹ گیا ہوں۔ اس رات کو یعنی 25 دسمبر کو خوب برف باری ہوئی۔ میرے لئے برف باری دیکھنے کا یہ پہلا مواقع تھا۔ ہر طرف سفیدی پھیلی ہوئی۔ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ڈک اور اس کے گھر والے کیتھولک تھے۔ یہ رات کو بارہ بجے عبادت کے لئے چرچ لے گئے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عید کی نماز میں ساتھ والے کو دیکھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے بھی وہی کیا کہ جو ان لوگوں نے کہا تھا اور یوں ان کی عبادت میں شریک ہوا۔

ڈک کے گھر تین دن رہا۔ اس کے والد صبح صبح آتے۔ ان کے ہاتھ میں گرم گرم چائے کا کپ ہوتا تھا‘ وہ میرے بستر کے قریب آ کر کہتے: ”ینگ مین‘ ہیراز اے لولی کپ آف ٹی۔“ بستر میں چائے پینے کی عیاشی وہیں ہوئی۔ تین دن بعد جب میں نے واپسی کے لئے کہا تو اس کی بہن سٹیشن تک چھوڑنے آئی اور میں واپس اپنے ہاسٹل چلا آیا۔

اس کے بعد لندن میں پاکستانیوں سے ملاقاتیں بڑھیں۔ بی بی سی کی اردو سروس میں اس وقت حسن ذکی کاظمی تھے۔ یہ حیدرآباد میں ریڈیو سٹیشن پر رہ چکے تھے اس لئے جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے از راہ مہربانی بی بی سی میں کچھ پروگرام دینے شروع کر دیئے۔ بش ہاؤس میں اس وقت اردو سروس کے لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔

مگر سب سے زیادہ دوستی لندن میں شریف برادران سے رہی۔ نذیر شریف اور نثار شریف ان سے رحیم صاحب نے تعارف کرایا جو اس وقت ہل میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایسی دوستی ہوئی کہ آج تک باقی ہے۔ ان کا گھر میرے لئے پناہ گاہ تھا۔ جب میں ہاسٹل چھوڑ کر ان کے گھر کے قریب رہنے لگا تھا تو روز رات کو ان

کے ہاں محفلیں جمتی تھیں۔ ان کا کچن مغلوں والا تھا۔ ہر وقت، ہر شخص کے لئے کھانا تیار۔ بعد میں اتفاق یہ ہوا کہ نذیر شریف صاحب میرے چھوٹے چچا کے کلاس فیلو نکل آئے۔ دونوں نے علی گڑھ میں ساتھ پڑھا تھا۔ انہی کے گھر پر مشرف خاں سے ملاقات ہوئی جو اس لئے مشہور تھے کہ یہ ہر کام بہت جلدی کرتے تھے۔

1960ء کی دہائی میں یورپ میں طالب علموں کی جو تحریکیں چلیں تھیں، ان کے اثرات انگلستان کی یونیورسٹیوں میں ابھی تک باقی تھے۔ مگر یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح ان کی اپنی روایات تھیں۔ اگر اسٹرائک کرتے، یا جلوس نکالتے تو اس کے لئے اتوار کا دن مقرر تھا۔ باقی دنوں میں پڑھائی میں مصروف رہتے تھے۔

کالجوں میں پرانی روایات چل رہی تھیں۔ ہر طالب علم کو ایک ٹیوٹر مل جاتا تھا۔ جو تحقیق میں اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ تحقیق کے لئے موضوع مل جاتا تھا۔ باقی کام لائبریری میں ہوتا تھا۔ پروفیسر سے پندرہ یا بیس دن میں ملاقات ہوتی تھی۔ اس لئے میرا زیادہ وقت یا تو اپنے کمرے میں گزرتا یا لائبریری میں۔ اچھے اور برے اساتذہ کی تفریق وہاں بھی تھی۔ ایک خاتون لیکچرار تھیں جو سارا لیکچر گردن جھکا کر پڑھ دیا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں آکر یہ احساس ہوا کہ میں نے اب تک جو کچھ پڑھا تھا وہ ناکافی ہے اور یہاں کے طالب علموں کے معیار تک آنے کے لئے مجھے انتہائی محنت کی ضرورت ہے۔

1970ء میں جب میں انگلستان گیا ہوں تو انڈیا و پاکستان کے اکثر لوگ محنت مزدوری کرتے تھے اور وہاں کی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے دن رات محنت کرکے اپنے خاندانوں کی زندگی بنائی اور خود زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔ چونکہ اکثریت ان پڑھ مزدور کی تھی اس لئے انگریز معاشرے میں ندوستانیوں کو، جس میں پاکستان بھی شامل تھا، عزت سے نہیں دیکھا جاتا تھا، نسل پرستی کے یہ جذبات کچھ دبے ہوئے تھے اور کچھ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

لیکن اب صورتحال بدل گئی ہے۔ جب میں آخری بار 1988ء میں انگلستان گیا تو ں نے دیکھا کہ اب ایشیائی کمیونٹی میں پیشہ ور لوگ آ گئے ہیں۔ اب یہ لوگ صرف

مزدور اور ان پڑھ لوگوں پر مشتمل کمیونٹی نہیں رہی ہے۔ اس لئے ایشیائی لڑکے و لڑکیاں بینکوں اور آفسوں میں کام کرتے نظر آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں اپنی شناخت کا جذبہ بھی زور و شور سے ابھر رہا ہے اور اس کا اظہار مذہبی علامات کے ذریعہ ہونے لگا ہے۔ مثلاً 1970ء کی دہائی میں صرف بیکر اسٹریٹ میں ایک مسجد تھی کہ جہاں لوگ جمعہ و عیدین کی نماز پڑھتے تھے۔ اب ہر محلہ میں مسجدیں ہیں جس کی وجہ سے مولوی کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ میرے وہ دوست بھی جو ایک زمانہ میں سیکولر تھے۔ اب نماز روزے کے پابند ہو گئے ہیں اور گھروں پر مولویوں کو بلاتے ہیں۔ قرآن خوانی، میلاد اور مرثیہ کی مجلسیں عام ہو گئی ہیں۔

یورپ میں ایک اچھی روایت ہے کہ طالب علم چھٹیوں میں یا فرصت میں مختلف قسم کام کرتے ہیں۔ یہ کام فیکٹریوں، اسٹورز اور آفسوں میں مل جایا کرتے ہیں۔ اس روایت کی وجہ سے طالب علم معاشرہ سے علیحدہ مراعات یافتہ طبقہ نہیں رہتے ہیں بلکہ کام کرنے کی وجہ سے ان کا واسطہ مزدوروں، کلرکوں اور معاشرے کے دوسرے طبقوں سے پڑتا ہے۔ اس لئے ان میں کام سے نفرت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ کام اور کام کرنے والے کی عزت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے طالب علم صرف کتابوں ہی سے نہیں بلکہ لوگوں سے بھی علم حاصل کرتا ہے۔ اس عملی تجربہ کی وجہ سے نوجوان زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ طالب علم اپنے والدین پر بوجھ نہیں رہتے ہیں۔ بلکہ اپنا خرچہ خود نکالتے ہیں۔ اس پیسہ سے وہ دنیا گھومتے ہیں اور زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

چونکہ میرے پاس پیسے وغیرہ تو تھے نہیں، اس لئے میں چاہتا تھا کہ اگر ہو سکے تو کہیں پارٹ ٹائم کام کر لوں۔ اس کا پہلا موقع مجھے اس طرح ملا کہ ایک دوست نے فون کیا کہ “ویک اینڈ” پر روٹی کی ایک فیکٹری میں کام ہے۔ ہم بھی وہاں جا رہے ہیں، تم بھی آ جاؤ کیونکہ ان دو دنوں میں ڈبل معاوضہ ملتا ہے۔ میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گیا۔ وہاں قاعدہ یہ تھا کہ دو آدمیوں کو ایک ویگن دی جاتی تھی اس میں انہیں

مختلف قسم کی روٹیاں ترتیب سے رکھنا ہوتی تھیں۔ وقت کا کوئی تعین نہیں تھا۔ چاہے روٹیاں دو گھنٹے میں رکھ دو چاہے آٹھ گھنٹے میں۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص باہر سے روٹیاں پھینکتا تھا، دوسرا اسے بازوؤں پر جھیل کر خانوں میں رکھتا جاتا تھا۔ دیکھنے میں تو معلوم ہوا کہ یہ تھوڑا سا کام ہے۔ مگر جب شروع ہوا تو پوری رات بیت گئی۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ جب صبح جا کر سویا اور دوپہر میں آنکھ کھلی تو پورا جسم بری طرح سے ٹوٹ رہا تھا۔ حالت اتنی خراب تھی کہ دوسری رات کام نہیں ہو سکا۔

لیکن اس کے بعد اس فیکٹری میں، میں نے کئی بار کام کیا۔ یہاں ہندوستان و پاکستان سے بہت مزدور تھے۔ ان سب سے دوستی ہو گئی۔ چائے کے وقفہ میں خوب گپ شپ ہوتی تھی اور پھر تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتے تھے۔

کام کرنے کا دوسرا موقع مجھے لندن کے ایک سپر اسٹور سیل فریجز میں ملا۔ 1971ء میں جب کرسمس آنے والی تھی اور وہاں سیل کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہاں مجھے دو یا تین دن کی ٹریننگ دی گئی۔ اس کے بعد مختلف اسٹالوں پر کھڑا کر دیا گیا کہ وہاں کام ہوتا ہوا دیکھوں۔ پھر ایک دن اچانک اسٹیشنری کے کیش رجسٹر پر بٹھا دیا۔ یہاں گاہکوں کی کافی تعداد ہوا کرتی تھی اس لئے پہلے دن تو پسینے چھوٹ گئے۔ کافی غلطیاں بھی کیں۔ گاہکوں کی لائن لگی تھی اور مجھ سے حساب کتاب میں دیر ہو گئی۔ لوگ بے چین ہو جاتے تھے۔ مگر ایک دن کے بعد یہ مسئلہ نہیں رہا۔ اسٹور والوں کا یہ طریقہ تھا کہ اچانک ایسی جگہ رکھو جہاں خوب رش ہو تاکہ اس کی جھجک دور ہو جائے۔ اس کے کچھ دن بعد مجھے ڈائریوں کے اسٹال پر بھیج دیا گیا۔ یہاں کام کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ ڈائریاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً بزنس مین کی ڈائری، کرکٹر کی ڈائری، استاد کی ڈائری وغیرہ۔ اس اسٹال پر کیلنڈرز بھی ہوا کرتے تھے۔ گاہکوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ جو اپنے پیشہ سے متعلق ڈائری خریدتے تھے۔ کبھی کبھی بوڑھی عورتیں آ جاتی تھیں جنہیں کیلنڈر پسند تو آتے تھے مگر خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ جب میں دیکھتا کہ وہ حسرت سے کیلنڈر دیکھ رہی ہیں۔ تو ان سے پوچھتا کہ کتنے پیسے

ہیں اور جتنے پیسے ان کے پاس ہوتے ان میں ان کا پسندیدہ کیلنڈر دے دیتا تھا۔

اس اسٹور میں کام کرنے کا بڑا لطف آیا۔ اسٹور میں ہر وقت ہنگامہ رہتا تھا۔ اکثر شاہی خاندان کے لوگ اور ایشیا افریقہ کے ملکوں کے سربراہاں بھی یہاں آتے۔ عرب حضرات خاص طور سے خوشبوئیں خریدتے تھے اور تھیلے بھر کر لے جاتے تھے۔ اسٹور میں چوری کو روکنے کے لئے' ان کے اپنے ایجنٹ ہوتے جو گاہک بنے ادھر ادھر گھومتے تھے اور خریداری بھی کرتے تھے۔ اکثر کسی کو چوری کرتے دیکھ لیتے تھے اس وقت تک کچھ نہیں کہتے تھے کہ جب تک وہ اسٹور میں رہتا تھا جب وہ باہر جاتا تو اس وقت اس سے رسید مانگتے تھے اور پھر پولیس کے حوالے کرتے تھے۔

یہ اسٹور سنٹرل لندن میں آکسفورڈ اسٹریٹ میں واقع ہے' اس لئے دوست و احباب یہاں آتے رہتے تھے۔ یہاں آ کر ہی پتہ چلا کہ سیل کا سلسلہ بھی ایک فراڈ ہے کیونکہ سیل کے لئے خاص طور سے مال تیار کرایا جاتا تھا اور اسٹور کا نارمل مال نیچے خانوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ گاہک سستا سمجھ کر خریدتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

کام کرنے کا ایک اور تجربہ سوینیر شاپ پر ہوا۔ یہ چھوٹا سا کیبن تھا جو ہولبورن ٹیوب سٹیشن پر تھا۔ سوینیر خاص طور سے گرمیوں کے موسم میں خوب بکتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں لندن میں سیاحوں کا سیلاب آیا ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی دلچسپ تھی۔ میرے اسٹال پر سوینیر اور سگریٹ تھے۔ اس لئے گاہک مصروف رکھتے تھے۔ باقی وقت میں' میں آکسفورڈ اسٹریٹ پر لوگوں کو آتا جاتا دیکھتا رہتا تھا۔

اس قسم کے مختلف کام کرنے کے بعد احساس ہوا کہ انسان کام کے ذریعہ کس قدر سیکھتا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اکثر گاہک خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ کچھ نک چڑھے اور لڑاکو۔ پاکستان میں رہتے ہوئے یہ تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اب کام کی عظمت کا احساس ہوا۔ اور ہمارے ہاں جو عزت کا سوال ہوتا ہے وہ ختم ہو گیا۔ واپس آ کر بھی اپنا کام خود کرنے کی عادت رہی۔ اکثر ہمارے ہاں صاحب حضرات کا بریف کیس چپڑاسی اٹھاتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔ اس کے بعد

سے یہ سب باتیں خرافات معلوم ہونے لگیں۔

جس زمانہ میں، میں انگلستان میں رہا، یہ پاکستان کی تاریخ کا بحرانی دور تھا۔ ایوب خاں کے بعد یحییٰ خاں برسراقتدار آ گئے تھے۔ پھر الیکشن اور مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی۔ انگلستان کے اخباروں میں فوجی کاروائیوں کی تفصیلات آتی تھیں۔ ریڈیو اور ٹی وی فوجیوں کے مظالم کی تفصیل بتاتے تھے۔ انگلستان میں رہنے والی پاکستانی کمیونٹی کی اکثریت فوج کے ساتھ تھی۔ ایک عرصہ سے شرپسند بنگالیوں کے بارے میں جو پروپیگنڈا تھا وہ یہاں بھی موجود تھا۔ بنگالیوں کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ جس وقت جنگ شروع ہوئی تو میں سیل فریجز میں کام کر رہا تھا۔ میرے ساتھ وہاں اور کئی بنگالی نوجوان کام کر رہے تھے۔ ان واقعات کی وجہ سے ان میں اور مغربی پاکستان کے لوگوں میں کھینچاؤ آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں فوجی کاروائی کے خلاف ہوں مگر اس وقت ان کے نزدیک تمام مغربی پاکستان ایک تھے۔ جنرل نیازی کی شیخی بیانات وہاں اخبارات کی سرخیاں بنتے تھے۔

اسی دوران میں وہاں پاکستانیوں نے ایک بڑا جلوس نکالا جو ٹرا فلگر اسکوائر پر جا کر ختم ہوا۔ مقررین نے پرجوش تقریریں کیں۔ جمیل الدین عالی نے قومی نغمے سنائے، لوگوں میں اس قدر جوش و جذبہ ہوا کہ جو حقیقت تھی اسے بھلا دیا۔ اگرچہ وہاں کے ذرائع ابلاغ میں خوب خبریں آ رہی تھیں مگر ان پر یقین کرنے پر کوئی تیار نہ تھا۔ افواہیں گردش کرتی تھیں کہ ہندوستان کو شکست پر شکست ہو رہی ہے اور ٹائیگر نیازی نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہیں۔ اس دوران یہ خبر آئی کہ ڈھاکہ فتح ہو گیا ہے اور پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

انسان کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ واقعات اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اگر نہیں ہوتے تو انہیں اپنے تخیل کی مدد سے بنا لیتا ہے اور ان مفروضوں کو سچ مان کر ان پر یقین کرتا ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں پاکستانیوں کی اکثریت جو سیدھے سادھے لوگ تھے۔ یہ یقین کرتے تھے کہ پاکستانی فوج کوئی مظالم نہیں کر رہی

ہے۔ برطانوی اخبارات کی خبروں کو پروپیگنڈا سمجھتے تھے، ریڈیو، ٹی وی ان کے نزدیک متعصب تھے۔ جب حقیقت سامنے آئی تب بھی کسی کا بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

بنگلہ دیش کا سانحہ ہماری تاریخ کا المیہ ہے۔ اس سے سبق سیکھنے کے بجائے یہ کوشش کی گئی کہ اسے بھلا دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم نے اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کیا اور فوجی کاروائیوں کو صحیح مان لیا، یا اس سے آنکھیں بند کرلیں، تو پھر اسی قسم کے واقعات بلوچستان اور سندھ میں ہوئے۔ یہ واقعات اس وقت تک ہوتے رہیں گے جب تک ہم اپنے جرائم کو تسلیم نہیں کریں گے۔

لندن میں، میں نے ڈیڑھ سال گزارا ہوگا، اس عرصہ میں، وہاں کی ثقافتی زندگی سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا چلا گیا تھا۔ سینما، تھیٹر، کلب اور وہاں کی لائبریریاں و باغات۔ لندن شہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر محلہ میں لائبریری اور پارک ضرور ہوتے ہیں۔ یہ میرا مشغلہ تھا کہ ان لائبریریوں میں جا کر پڑھا کرتا تھا۔ جس کتاب کی ضرورت ہوتی، وہ لائبریری فوراً فراہم کر دیتی تھی۔ باغ میں خاموشی سے بنچ پر بیٹھ کر فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا اچھا لگتا تھا۔ اس وقت اور بھی لطف آتا تھا کہ جب کوئی بوڑھا جوڑا سامنے سے گزرتے ہوئے مسکرا کر دیکھتا اور گردن ہلا کر خوش آمدید کہتا۔ کبھی کبھی ہائیڈ پارک چلا جاتا جہاں جگہ جگہ مقررین زوردار تقریریں کرتے ہوتے تھے اور سامعین ان پر ہوٹنگ میں مصروف ہوتے تھے۔ میں نے لندن کا کافی حصہ پیدل چل کر دیکھا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ، ریجنٹ اسٹریٹ، پکاڈلی اور نائٹس برج کے علاقے لندن کی جان ہیں۔ یہاں کے جنرل اسٹورز میں لوگوں کا بے تحاشہ رش رہتا ہے۔ میں فرصت کے لمحات میں یہاں اکثر چکر لگایا کرتا تھا۔ جب میں خود کو بہت زیادہ تنہا محسوس کرتا تو میں ٹرا فلگر اسکوائر سے چلتا ہوا پارلیمنٹ کی عمارت تک جایا کرتا تھا اور یہاں دریائے ٹیمز میں چلنے والی کشتیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ میرا دل لندن میں لگ گیا تھا۔ میں اس کے گلی کوچوں سے واقف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مزاج کو سمجھنے لگا تھا۔ مگر

میرے لئے اہم سوال یہ تھا کہ میں اپنی تعلیم کو کیسے جاری رکھوں۔ غیر ملکی طالب علموں کے لئے فیس لگا دی گئی تھی۔ کام کرتے ہوئے پڑھنا مشکل بھی تھا اور اس میں کافی وقت بھی لگتا۔ اس دوران کسی نے کہا کہ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں کوئی ٹیوشن فیس نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو جرمنی ہی چلا جائے۔ دو چار یونیورسٹیوں کو خط لکھے۔ روھر یونیورسٹی سے جواب آیا کہ وہاں میرا داخلہ جب چاہوں ہو جائے گا۔ لہٰذا فوراً فیصلہ کیا کہ یہاں ہی جایا جائے۔ جن صاحب کی طرف سے یہ خط آیا تھا، وہ ہسٹری کے شعبہ کے تھے۔ ان کا نام تھا ڈاکٹر فوکوایولین۔ میں نے جواب دیا کہ میں آ رہا ہوں۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں کر دیں۔ جب تک کہ دوسرا انتظام نہ ہو۔ یوں میں انگلستان سے جرمنی کے لئے روانہ ہوا۔

☆

بوخم

فروری 1972ء کا وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں جرمنی کے لئے روانہ ہوا۔ شریف صاحب کے گھر سارے دوست جمع تھے۔ وہیں سے میں مشرف و نثار شریف کے ہمراہ روانہ ہوا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس پہلے ہی بک کرا کے بھجوا دیا تھا لہذا میرے ہاتھ میں ہلکا سا بیگ تھا۔ یہ سخت سردی کی رات تھی۔ برف باری سے ہر طرف سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ سٹیشن پر بلب کی روشنی میں سفیدی بڑا اداس منظر پیش کر رہی تھی۔ میں لندن سے اب ایک ایسی جگہ جا رہا تھا جہاں میرا کوئی دوست اور جاننے والا نہیں تھا۔ جب ٹرین چلی تو میں نے ہاتھ ہلا کر ان دوستوں کو خدا حافظ کہا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان طالب علم تھا جو یورپ کے دور پر تفریح کی غرض سے جا رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں' باہر سفید پڑی ہوئی برف نظر آ رہی تھی۔ ہمیں ڈوور تک ٹرین سے جانا تھا' پھر جہاز کے ذریعہ انگلش چینل عبور کرنا تھی اور پھر ٹرین سے جرمنی۔ اس وقت تک مغربی یورپ میں پاکستانیوں کے لئے کوئی ویزا نہیں تھا۔ وہ تین مہینے بطور ٹورسٹ کسی بھی ملک میں جا سکتے تھے۔ اس لئے جب میں جہاز سے اتر کر ٹرین پکڑنے سٹیشن پر آیا تو وہاں کھڑے ریلوے گارڈ سے پوچھا کہ بوشم کون سی ٹرین جائے گی۔

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ: ”میں نے تو یہ نام زندگی میں کبھی نہیں سنا۔“

اس کا جواب سن کر میں یکدم پریشان ہو گیا۔ کیا مطلب؟ کیا مجھے جہاں جانا ہے وہ

کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنا ٹکٹ نکالا اور اسے دکھایا۔

ٹکٹ کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور کہا "اخ سو! بوخم! معلوم ہوا کہ اب تک انگلستان میں رہتے ہوئے جو تلفظ ادا کر رہے تھے وہ وہیں رہ گیا تھا۔ انگریزی "خ کو ش" بنا دیتا ہے۔ لہٰذا بوخم جانے کے لئے صحیح ٹرین مل گئی۔

جب میں بوخم پہنچا تو صبح کے دس بجے تھے۔ اپنے اردگرد ہر طرف سے جرمن بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں کہ جن کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ انگریزی بولو تو بڑی مشکل سے سمجھتے تھے۔ کسی نے رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ میں ٹرام لے کر مارک اسٹرا سے چلا جاؤں۔ اس کے آگے یونیورسٹی ہے۔ جب میں یونیورسٹی کے اسٹاپ پر اترا تو دیکھا کہ زبردست تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ کچھ بلڈنگیں بنی ہوئی تھیں اور باقی بن رہی تھیں۔ وہاں سے میں انفارمے سیون یعنی انفارمیشن کے کمرے میں گیا اور معلوم کیا کہ گیسٹ ہاؤس کہاں ہے؟ اس پر دفتر میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ گیسٹ ہاؤس کہاں ہے۔ ادھر ادھر فون کئے گئے، آخر میں پتہ چلا کہ وہ یونیورسٹی کیمپس میں نہیں بلکہ شہر میں ہم بولڈ اسٹراسے پہ ہے۔ ایک طالب علم جو وہاں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا اسے رحم آیا اور کہنے لگا کہ آؤ پہلے مینزا (Mensa) یعنی کنٹین میں کھانا کھاتے ہیں، پھر میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ راستہ میں اس نے جب وہی سوالات کئے کہ جو عام طور سے اجنبیوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے کہا پاکستان سے۔ اس وقت سیاسی پناہ لینے کے لئے لوگ جوق در جوق نہیں گئے تھے۔ اس لئے پاکستان کی بدنامی نہیں تھی۔ لہٰذا کہنے لگا کہ تم جرمنوں کو کیسا سمجھتے ہو؟ میں نے کہا وہاں تو جرمنی کے بارے میں ایک ہی بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ ہٹلر یہاں کا تھا اور ہمارے ایک شاعر جوش نے تو اسے ہٹلر اعظم کا خطاب دے دیا تھا۔ اس نے چلتے چلتے سر پکڑ لیا اور کہنے لگا کیا کوئی بیتھودن، گوئٹے اور شلر کو نہیں جانتا۔ میں نے کہا جانتے ہوں گے مگر مشہور نہیں ہیں جرمنی کی پہچان اب تو صرف ہٹلر رہ گیا ہے۔

مینزا میں کھانا کھانے گئے تو دیکھا کہ ایک وسیع و عریض ڈائننگ ہال ہے اس

عمارت میں تین قسم کے کھانے ملتے ہیں۔ ایک ٹوکن لے کر، ایک اس سے ذرا قیمتی کہ جہاں ہر ڈش کی علیحدہ علیحدہ قیمت ہے۔ اور کیفے ٹیریا جہاں سینڈوچز ملتے ہیں۔ سب ملا کر چار پانچ ہزار طالب علم بیک وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔ وہاں کھانا کھایا، اس کے بعد وہ مجھے لے کر گیسٹ ہاؤس آیا۔ یہاں میرا کمرہ بک تھا۔ کھانا یہاں نہیں ملتا تھا اس کے لئے باہر جانا پڑتا تھا۔ یہاں پہنچ کر دیکھا کہ باتھ روم میں تالہ پڑا ہوا ہے۔ معلوم کرنے پر کہا کہ نہانے کے پیسے علیحدہ دینے ہوں گے۔ اس گیسٹ ہاؤس میں کچھ ہندوستانی ٹھہرے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان سے سلام دعا ہوئی۔ انہوں نے قریبی ہوٹلوں کے بارے میں بتایا جہاں سستا کھانا مل جاتا تھا۔

دوسرے دن صبح صبح میں اسٹراسن بان، یعنی ٹرام میں سوار ہو کو یونیورسٹی پہنچا۔ یونیورسٹی کو انہوں نے دو خاص حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ میں نیچرل سائنسز کے شعبہ ہیں، دوسرے میں آرٹس کے جو جرمن زبان میں "روحانی علوم" کہلاتے ہیں۔ روھر یونیورسٹی دوسری جنگ کے بعد سے بننی شروع ہوئی تھی۔ یہ علاقہ جرمنی کا صنعتی علاقہ ہے۔ ایک کہانی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس علاقہ میں اس سے پہلے کوئی یونیورسٹی نہیں تھی کیونکہ کائزر (قیصر) اور کرپس (Krupps) جو کہ جرمنی کی بڑی صنعتی فرم ہے، ان میں یہ معاہدہ تھا کہ اس علاقہ میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہوگی تاکہ انہیں ورکرز آسانی سے ملتے رہیں۔ اب جنگ کے بعد یہ یونیورسٹی بنائی تو اس میں پورا جرمن کردار جھلکتا ہے۔ تمام عمارتوں سے مضبوطی اور استحکام کا احساس ہوتا ہے۔ کھردری، سنگلاخ، ان عمارتوں میں کہیں نزاکت اور جمالیاتی ذوق نہیں ہے۔ یونیورسٹی کی ہر عمارت وسیع و عریض اور کشادہ ہے۔ اس کا جو ہال بنایا گیا ہے۔ اس میں بیس ہزار سامعین کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اس کا اسٹرکچر کو عام طور سے جرمنی میں پسند نہیں کیا گیا۔ مگر یہ عمارت جدید جرمنی کی علامت ہے۔

ہسٹری ڈیپارٹمنٹ بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ہے۔ وہاں کے آفس میں جا کر میں نے ڈاکٹر ایولین کے بارے میں دریافت کیا تو ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ سرخ داڑھی، نیلی آنکھیں، ہنس مکھ اور دوست۔ مل کر بڑے خوش ہوئے۔ میں یہ سمجھا تھا

کہ یہ پروفیسر ہوں گے اور ان ہی کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ مگر وہ ٹیکنیکل ہسٹری پڑھاتے تھے اور شعبہ کے منتظم تھے۔ کہنے لگے کہ شعبہ میں کئی ادارے ہیں، کل بارہ پروفیسر ہیں، ان سے مل لو، جو تیار ہو جائے اس کے ساتھ کام شروع کر دو۔

میں پہلی ملاقات کے لئے جدید تاریخ کے پروفیسر ہانس مومزن کے آفس گیا۔ ان کی سیکرٹری نے کہا کہ پندرہ دن بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ صاحب جرمنی کے مشہور مورخ ہیں۔ ان کے نانا کو ادب کا نوبیل پرائز بھی مل چکا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اتنے مشہور آدمی سے دور رہا جائے تو اچھا ہے۔ دوسرے پروفیسر قرون وسطی یورپ کے ماہر تھے، ذائبت (Seibt) ان کی سیکرٹری کے ساتھ کمرے میں ایک بڑا سا کتا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ ایسا موضوع منتخب کر لیتے ہیں کہ جس میں انڈیا اور یورپ کا کوئی تعلق ہو۔ پھر پوچھا کہ جرمنی کیسا لگا۔ باتوں باتوں میں بولے، ہاں ادھر کے علاقہ میں آ کر مجھے بھی اجنبیت کا احساس ہوا۔ ان کا تعلق جنوبی جرمنی کی ریاست بویریا سے تھا۔ بویریا والے خود کو سب سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔

اس دوران پتہ چلا کہ یہاں پولیٹکل سائنس کے شعبہ میں ترقی پذیر ملکوں پر ایک انسٹی ٹیوٹ ہے، اس میں پروفیسر ہانس کروزے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن میں رہ چکے ہیں، اچھی اردو بولتے ہیں، ان سے مل لو۔ ایک دن میں ڈھونڈتا ہوا ان کے پاس چلا گیا۔ فورا" مل گئے، اردو میں بات چیت ہوئی۔ کہنے لگے کہ ادھر ادھر پروفیسروں کے چکر میں پڑنے کی بجائے اچھا یہ ہے کہ پروفیسر بوسے سے مل لو، یہ مشرقی علوم کے ڈائریکٹر ہیں۔ میرے دوست ہیں، تمہیں ان کے ساتھ کام کر کے فائدہ ہو گا۔ ان کی ہدایت پر میں فورا" ہی پروفیسر بوسے (Busse) کے پاس چلا گیا۔ یہ سرخ و سفید اور گھٹے ہوئے جسم کے سنجیدہ شخص نکلے۔ ایک گھنٹہ تک ان سے باتیں رہیں۔ کہنے لگے کہ فارسی و عربی جانتے ہو۔ میں نے کہا فارسی سکول و کالج میں پڑھی تھی مگر عربی بہت کم جانتا ہوں۔ انہوں نے امتحان لینے کی غرض سے عربی کی ایک کتاب اٹھا کر دی اور کہا اسے پڑھو۔ عربی پڑھنا کیا مشکل تھا، میں نے فر فر پڑھ دی۔ کہنے لگے کہ تمہاری عربی تو بہت اچھی ہے۔ میں نے کہا، ہاں، مگر اس کے معنی معلوم نہیں۔ بغیر سمجھے پڑھ

لیتے ہیں۔

اس انٹرویو کے بعد انہوں نے ہی کہا کہ اچھا' مغل دربار اور اس کی رسومات پر کام کرو۔ وہ خود اس وقت ایران کی تاریخ پر کام کر رہے تھے۔ لہٰذا ان کی دلچسپی مغلوں سے بھی ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً" حامی بھر لی اور یوں میں نے مغل دربار پر کام شروع کر دیا۔

لیکن باقاعدہ داخلہ کے لئے ضروری تھا کہ جرمن زبان کا امتحان پاس کیا جائے۔ زبان کے یہ کورسز یونیورسٹی میں بھی ہوتے ہیں اور پرائیویٹ اداروں میں بھی۔ جب میں نے گیسٹ ہاؤس چھوڑا' تو کچھ دن ایک ہاسٹل میں گزارے' اس کے بعد چرچ کے ایک ہاسٹل میں کمرہ مل گیا۔ اس ہاسٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں جرمن زبان بھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ ہاسٹل "گرانڈولے" کہلاتا ہے اور مارک اسٹراسے پر واقع ہے۔ اس ہاسٹل میں صرف سال بھر کے لئے کمرہ دیا جاتا ہے تاکہ پھر نئے طالب علموں کو جو زبان سیکھتے ہیں انہیں جگہ مل سکے۔

ہمارے ساتھ زبان سیکھنے کے لئے کئی ملکوں کے طالب علم تھے۔ تھائی لینڈ' کوریا' ملیشیا' مصر اور افریقہ کے کئی ملکوں سے آئے ہوئے نوجوان۔ جب ہم نے کورس شروع کیا تو یہاں جرمن سکھانے کے لئے انہوں نے نیا تجربہ کیا' یعنی انگریزی کی مدد سے زبان پڑھانا۔ مگر اس میں مشکل یہ تھی کہ کئی طالب علم تھے کہ جو انگریزی سے بالکل واقف نہیں تھے اس لئے ایک دن سینگال سے آئے ہوئے طالب علم سوگو نے کہا کہ وہ جرمن سے زیادہ انگریزی سیکھ رہا ہے۔

جرمن زبان سیکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کی گرائمر بڑی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں جرمن زبان پریشان کرنے لگی اور اس کو سیکھنا ایک عذاب معلوم ہونے لگا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کلاس سے کہا گیا کہ کیا وہ ایک کوئلے کی کان کی سیر پسند کریں گے یا حسب معمول کلاس میں پڑھنا تو سب نے کان کی سیر کرنا پسند کیا۔ جب ہم کان کی گہرائیوں میں پہنچے' خاص طور سے اس جگہ کو جہاں سے کوئلہ نکالا جاتا ہے' اور کئی جگہ تو جھک کر یا گھٹنوں کے بل

چلنا پڑا، تو کوریا کے طالب علم کم نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اس اذیت سے تو جرمن کلاس کی اذیت ہی اچھی تھی۔

جرمن میں ہاسٹلوں کا نظام انگلستان سے مختلف ہے۔ انگلستان میں بستر کی چادریں صفائی کرنے والی عورت خود بدلتی تھی۔ کچرا بھی ہاسٹل کا اسٹاف اٹھاتا تھا اور وہاں میس کا طریقہ ہے کہ جہاں ناشتہ و شام کا کھانا ملتا تھا۔ چھٹی کے دنوں میں تینوں وقت کا کھانا میس سے ملتا تھا۔ جرمنی میں ہفتہ بعد خود جا کر چادریں لانا ہوتی تھیں۔ ہر فلور سے اکٹھا کر کے تمہارا کوڑا کرکٹ طالب علم باری باری لے جا کر کوڑے دان میں ڈالتے تھے۔ یہاں میس کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ فلور پر ایک بڑا سا کچن ہوتا ہے کہ جہاں طالب علم اپنا کھانا خود پکاتے ہیں۔ عام طور سے شام کو یونیورسٹی سے واپس آ کر فلور کے طالب علم کھانا پکانے جمع ہو جاتے ہیں اور ایک سوشل کلب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

گرانڈولے ہاسٹل میں جب میں گیا ہوں تو یہاں اکثریت غیر ملکی طالب علموں کی تھی جن میں افریقی عرب، ایرانی، ویت نامی، ترک اور جنوبی امریکہ کے بہت سے ملکوں سے آئے ہوئے نوجوان تھے۔ ہر ہفتہ کی شام کو تہہ خانہ میں ڈسکو ہوا کرتا تھا، جس میں شرکت کے لئے باہر سے بھی طلباء آیا کرتے تھے۔ میں اگرچہ کھانا پکانے کی ابتداء لندن سے کر چکا تھا۔ مگر اصل میں ماہر یہاں آ کر ہوا، کیونکہ مینزا کا کھانا کبھی اچھا ہوتا تھا اور کبھی نہیں اس لئے خود ہی پکانا شروع کر دیا۔ شام کو کچن میں جب سب اکٹھے ہوتے تو بڑی گپ شپ رہا کرتی تھی۔

مشرقی اور مغربی لوگوں کی عادات و اطوار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس کی کچھ جھلکیاں ہاسٹل میں رہ کر نظر آئیں۔ جب ایران، عرب یا افریقی طالب علم اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے تو جرمن طلبہ کو حیرت ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک طرف اکیلا بیٹھا کھانا کھاتا تھا۔ جرمنی میں دستور ہے کہ دوپہر کا کھانا ان کا خاص کھانا ہوتا ہے، اس لئے یہ گرم کھاتے ہیں، شام کو وہ ٹھنڈا کھانا کھاتے ہیں۔ جو ان کی "شام کی روٹی" (Abendbrot) کہلاتا ہے۔ ہم دیکھتے تھے کہ پنیر، مکھن، ساسے جیز اور دودھ لے کر

بیٹھ جاتے تھے اور تنہا کھاتے تھے۔ لیکن ہم جب بھی کھاتے تھے مل کر، تنہا نہیں، اور ہمیشہ گرم کھانا۔ جرمن طالب علموں کو جب بھی دعوت دیتے تھے وہ خوشی خوشی اسے قبول کر لیتے تھے اور مسالے دار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مہینوں میں ان کی بھی عادت بدل گئی اور اب وہ بھی ہمیں اپنے کھانے میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔

ہمارے کھانے چونکہ مسالہ دار ہوتے ہیں اس لئے جب ہاسٹل میں کوئی بھی یہ کھانے پکاتا تو اس کی خوشبو پورے ہاسٹل میں پھیل جاتی تھی اور ہر ایک کو پتہ چل جاتا تھا کہ ہمارے کھانے پک رہے ہی۔

جرمنی کے ہاسٹلوں میں ایک روایت یہ ہے کہ یہاں ہر سال ہاسٹل میں کلچرل سرگرمیوں کا انتظام کرنے کے لئے ٹیوٹر کا الیکشن ہوتا ہے۔ اس بار جب یہ الیکشن ہوئے تو میں بھی امیدوار ہو گیا۔ میری دوستی عربوں، ترکوں اور افریقی طالب علموں سے ہو چکی تھی اس لئے جب نتائج نکلے تو میں الیکشن جیت گیا۔ اس کا مجھے فائدہ یہ ہوا کہ ایک سال کے لئے مجھے ہاسٹل میں کمرہ مفت مل گیا اور 150 مارکس مہینہ کے ملنے لگے۔ ہم دو ٹیوٹرز منتخب ہوئے تھے لہٰذا ہم نے ایک سال کے دوران کافی سرگرمیاں کیں۔ لیکچرز کرائے، فلمیں دکھائیں، دعوتیں کیں، مختلف قسم کے کھانوں کا مقابلہ کرایا۔

ہاسٹل میں رہتے ہوئے، دلچسپ اور حیرت انگیز شخصیتوں سے واسطہ بھی پڑا۔ ان میں سے ایک ابھی تک یاد ہے، "جلو" یہ شاید نائجیریا کا رہنے والا تھا اسمارٹ، تیز و طرار اور خوب بولنے والا۔ ایک دن لفٹ میں مل گیا۔ مجھ سے فوراً سوال کیا کہ "برادر تم کہاں سے آئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "پاکستان۔"

وہ بولا: "اوہ پاکستان" "ذوالفقار علی بھٹو میرا ذاتی دوست ہے۔ چلو میرے ساتھ کمرے تک چلو، اس کے خطوط جو اس نے مجھے لکھے ہیں بتاتا ہوں۔"

کمرے میں جا کر اس نے فائل نکالی جس میں دنیا بھر کے سربراہان مملکت کے خطوط اور ان کی تصاویر تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ان کا مشغلہ ہے کہ روز یہ آٹھ یا

دس ملکوں کے سربراہوں کو خط لکھتے ہیں جن کے جوابات آتے ہیں۔ انہیں میں بھٹو کے سیکرٹری کا خط تھا اور ان کی ایک تصویر۔

کہنے لگا: ''الحمدللہ' میں بھی مسلمان ہوں' میری خواہش ہے کہ پاکستان جا کر پڑھوں۔'' میں نے کہا: ''ضرور' سفارت خانہ خط لکھو' وہ وظیفہ کے فارم بھیج دیں گے' درخواست دیدو' شاید وظیفہ مل جائے۔''

اس سے کچھ دن بعد ملا' اور کہنے لگا کہ میرے پاس فارم تو آگیا ہے مگر اس میں کچھ باتیں تو تم سے پوچھنا ہیں۔ میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کہا کہ اس میں سرٹیفکیٹ مانگے ہیں' میں کیا کروں۔

میں نے کہا: ''تم نے کیا پاس کیا ہے؟'' اور کیا تمہارے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہے' مثلاً اسکول کا' میٹرک وغیرہ کا۔''

کہنے لگا: ''اور تو کوئی سرٹیفکیٹ نہیں' مگر میرے ہیڈ ماسٹر کا ایک سرٹیفکیٹ ہے جس میں لکھا ہے کہ اگرچہ یہ امتحان میں تو فیل ہو گیا ہے مگر کلاس کا سب سے ذہین طالب علم ہے۔''

ظاہر ہے کہ اس سرٹیفکیٹ پر اسے کہیں بھی داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ پتہ نہیں کہ جرمنی میں کیسے ٹھہرا ہوا تھا۔ رہتا تھا ہمیشہ ٹپ ٹاپ۔ سوٹ' ٹائی' چمکدار پالش کئے جوتے' ہاتھ میں خوبصورت بریف کیس' طالب علم سے زیادہ ڈپلومیٹ لگتا تھا۔ ایک دن لفٹ میں میرے ایک ہندوستان دوست سروپریا سے مل گیا۔ ان سے بھی پوچھ گچھ شروع کر دی کہ کون ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ جب انہوں نے میرا نام لیا تو فوراً بولا: ''مبارک' میرا پکا دوست ہے' کامریڈ' کیا مجھے تیں مارک ادھار دے سکتے ہو' میرے گھر سے پیسہ آئے نہیں ہیں' جیسے ہی آئیں گے واپس کر دوں گا۔'' سروپریا' عرصہ سے جرمنی میں تھے اور شاید ایسی صورت حال سے کئی بار دوچار ہوئے ہوں' اس لئے وہ اس کے جھانسہ میں نہین آئے۔

انہی دنوں ہاسٹل میں ایک سردار جی آ گئے۔ سردار ریوندر سنگھ آلو و اہلیہ۔ یہ انڈیا میں پولیس میں تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ جرمنی میں پیسہ کمانے کی بہت گنجائش

ہے۔ لہٰذا انہوں نے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ، ملازمت چھوڑ چھاڑ کر عازم جرمنی ہوئے، خشکی کے راستے سے آئے تھے۔ اور جیسا کہ سکھ ہوتے ہیں، ہنس مکھ، خوش مزاج اور لطیفے سنانے والے۔ ان کے آنے سے نہ صرف ہاسٹل میں رونق ہو گئی بلکہ بوخم شہر کو بھی ایک سردار جی مل گئے۔ اس سے پہلے اہل بوخم نے کسی سردار کو نہیں دیکھا تھا۔ جو چیز انہیں ممتاز کرتی تھی وہ ان کی پگڑی تھی۔ سردار جی جدھر نکل جاتے تھے لوگ رک رک کر انہیں دیکھتے تھے۔ اپنی اس انوکھی شخصیت سے سردار جی نے پورا پورا فائدہ اٹھایا کیونکہ انہیں لوگوں سے دوستی کرنے میں دقت پیش نہیں آئی۔

آئے تو تھے وہ ملازمت کے لئے مگر جب ملازمت کے کوئی چانس نہیں دیکھے تو سوچا کہ پڑھ لیا جائے۔ تاریخ میں چندی گڑھ سے تھرڈ کلاس میں ایم اے تھے۔ جو تھوڑی بہت تاریخ پڑھی ہو گی وہ پولیس کی ملازمت میں کھو چکے تھے۔ میں نے ایک دن انہیں وسط ایشیا کے ادارے کے پروفیسر سے ملوایا۔ سردار جی کا اصرار تھا کہ وہ سکھوں کی تاریخ پر کام کریں گے، اس ملاقات کے کچھ دن بعد پروفیسر صاحب سے یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ تم نے ایک سکھ سے ملوایا تھا، مگر اس کے بعد ایک دوسرا سکھ بھی ملنے آیا، پہلے والا سرخ پگڑی میں تھا اور دوسرا نیلی پگڑی میں۔

میں نے پروفیسر کی بات تو سن لی۔ مگر سردار جی سے کہا کہ جب بھی پروفیسر سے ملو تو ایک ہی رنگ کی پگڑی میں جایا کرو۔ ورنہ تمہارے بجائے کسی اور کو ڈگری مل جائے گی۔ سردار کا یہ کام تو ہو گیا۔ مگر یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے جرمن زبان پاس کرنا ضروری تھی۔ یہ سردار جی کے لئے مصیبت بن گئی۔ زبان سیکھنے کی غرض سے سردار نے ایک گرل فرینڈ بھی رکھی، مگر کام اس سے بھی نہ بنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردار جی جرمنی سے بیزار ہو گئے۔ کہنے لگے کہ کینیڈا جاتا ہوں، وہاں انگریزی ہے، اس لئے وہاں کام بن جائے گا۔

اس عرصہ میں سردار جی اور جلو میں کچھ رقیبانہ اور کچھ مخالفانہ تعلقات پیدا ہو چکے تھے لہٰذا جب جلو نے یہ سنا تو کہنے لگا کہ "اس کی جرمن انگریزی سے اچھی ہے، وہاں جا کر کیا کرے گا۔"

سبھی نے سمجھایا مگر سردار جی نہ مانے، اور ایک دن ہم سب سے رخصت ہو کر کینیڈا سدھارے۔ ان کی غیر حاضری کو ہم سب ہی نے محسوس کیا۔ کوئی ایک ہفتہ ہوا ہو گا کہ ان کا فون آیا۔ میں بڑا خوش ہوں کہ سردار جی کینیڈا جا کر بھی نہیں بھولے۔ میں نے پوچھا۔ "سردار جی کہاں سے بول رہے ہیں۔"

کہنے لگے: "نیچے سے، نیچے آؤ اور دروازہ کھولو۔"

میں اتر کر نیچے گیا، دیکھا تو سردار جی حسب معمول مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ کمرے میں آئے تو کہنے لگے: "کینیڈا جا کر خراب تجربہ ہوا۔ اول تو ائیرپورٹ ہی روک لیا، انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میں اسٹوڈنٹ ہوں، بڑی مشکل سے جانے دیا۔ پھر یونیورسٹی میں کہ جہاں داخلہ لیا تھا، وہاں ان کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ملازمت کے امکانات بھی کم تھے، اس لئے سوچا کہ کون وقت ضائع کرے، واپسی کا ٹکٹ تو تھا ہی، فوراً" آگیا۔" جلو کو پتہ چلا تو کہنے لگا: "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ اس کی انگریزی خراب ہے، اس کو واپس آنا ہی تھا۔"

اب سردار جی کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جرمن پڑھیں اور یہیں سکھ تاریخ پر تحقیق کریں۔ اب جب انہوں نے پہلی مرتبہ سکھ تاریخ پڑھنی شروع کی تو جو وہ پڑھیں ان کے لئے نیا تھا۔ اس لئے ہر مرتبہ نئے انکشاف پر وہ بھاگے ہوئے میرے پاس آئے۔ کھان صاحب یہ تو مجھے آج معلوم ہوا کہ فلاں واقعہ تو یہ تھا۔"

اب سردار جی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ جرمن زبان کا امتحان کیسے پاس کیا جائے۔ انہوں نے اس کا بھی حل نکال لیا۔ جب امتحان ہوا کرتا تھا تو اس میں کسی رول نمبر کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، جس کا دل چاہے ہال میں جا کر بیٹھ جائے، کاپی پر اپنا نام لکھے اور امتحان دے دے۔ جو تحریری امتحان میں پاس ہو جاتے تھے، ان کا زبانی امتحان ہوتا تھا۔ سردار جی نے اس امتحان کے طریقہ سے فائدہ اٹھایا اور اپنی جگہ اپنی گرل فرینڈ کو بھیج دیا۔ تحریری امتحان پاس کر کے سردار جی کو زبانی امتحان کے لئے تو خود جانا تھا، چونکہ اس میں زبانی بات چیت کرتے تھے، کچھ پڑھوا کر سکتے تھے، وہ مرحلہ سردار جی نے

کامیابی سے طے کر لیا اور جرمن امتحان پاس کر لیا۔

لیکن یہ خبر چھپی نہیں رہی کیونکہ یونیورسٹی اب تو کچھ کر نہیں سکتی تھی مگر بعد میں امتحان میں امیدواروں کی چھان بین ہوتی تھی۔ سردار جی نے جرمنی کے ناقص طریقہ تعلیم کو درست کروا دیا۔ ہم جب تک جرمنی میں رہے' سردار جی سے دوستانہ و خوشگوار تعلقات رہے۔ ہمارے آنے کے بعد سنا کہ انہوں نے لندن میں اپنی برادری کی کسی لڑکی سے شادی کر لی۔ جب بیوی مل گئی تو انہوں نے پی ایچ ڈی کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس انڈیا چلے گئے۔ جب تک سردار جی رہے خود بھی خوش رہے اور اوروں کو بھی خوش رکھا۔

1972ء کی بات ہے کہ جب جون و جولائی میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو سوچا کہ اس دوران کچھ کام کر کے تھوڑے بہت پیسے اکٹھے کئے جائیں۔ چھٹیوں میں کام کے سلسلہ میں یونیورسٹی کا ایک شعبہ ہوتا ہے جن کے پاس مختلف جگہوں سے کام کی ضرورت کے مطابق درخواستیں آ جاتی ہیں۔ مجھے اور میرے ایک ساتھی منور جنہیں ہم مونی کہا کرتے تھے اور جو ہمارے دیکھتے دیکھتے پاکستانی سے بنگلہ دیشی ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو ووپرٹال کی ایک ٹائر بنانے کی فیکٹری میں کام ملا۔ اس کے لئے مصیبت یہ تھی کہ صبح چار بجے اٹھ کر بوخم شہر کے صدر میں جانا ہوتا تھا۔ وہاں سے بس کے ذریعہ ووپرٹال۔ واپس آتے آتے چھ بج جایا کرتے تھے۔ فیکٹری میں کام کرنے سے کافی تجربہ ہوا۔ ہمارے ساتھ جو جرمن ورکرز کام کرتے تھے' کام کے دوران ان سے کافی بات چیت ہوتی تھی۔ کام ختم ہونے پر یہ سب لوگ ایک بڑے ہال میں آتے جہاں شاورز لگے ہوئے تھے۔ یہ سب ننگ دھڑنگ مل کر نہاتے اور پھر تین پیس کا سوٹ پہن کر اپنی کاروں میں واپس ہوتے۔ ہماری تو کبھی اتنے لوگوں کے درمیان نہانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ لہٰذا جلدی سے اپنے کپڑے پہن کر واپسی کا راستہ لیتے تھے۔ ہاسٹل واپسی پر مونی کی گرل فرینڈ سوزی ہمارے لئے کھانا پکا کر تیار رکھتی تھی۔ کھانا کھا کر فوراً سونے کو دل چاہتا تھا۔ مگر دوسرے دن صبح سویرے اٹھنے کا ڈر بھی رہتا تھا۔

ابھی مشکل سے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ لندن سے ہمارے دوست عباس زیدی آ

گئے اور اصرار کیا کہ جرمنی کی سیر کرنی ہے۔ ہم نے فیکٹری سے ایک مہینہ کا معاہدہ کیا تھا۔ اگر ویسے ہی ملازمت چھوڑتے تو ایک ہفتہ کی مزدوری جاتی۔ اس لئے میں اور مونی دو علیحدہ علیحدہ ڈاکٹروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ہم سخت بیمار ہیں اس لئے ایک ہفتہ کی میڈیکل کی بنیاد پر چھٹی چاہئے۔ میرا واسطہ ایک خاتون ڈاکٹر سے ہوا۔ وہ فیکٹری کی محنت اور مجھے دیکھ کر متاثر ہوئی۔ اور یہ سرٹیفکیٹ دے دیا۔ مونی بھی کسی نہ کسی طرح سے یہ سرٹیفکیٹ لے آیا۔ اب ہم نے سوچا کہ بجائے اس کے کہ ٹرین سے سفر کریں۔ ایک سیکنڈ فوکسی خریدتے ہیں اور اس پر میونک تک جاتے ہیں۔

اس کے بعد سے سیکنڈ ہینڈ کاریں دیکھی گئیں۔ چار سو مارک میں ایک فوکسی خریدی دیکھنے میں تو ٹھیک معلوم ہوتی تھی مگر ہمارے ایک پادری دوست کا کہنا تھا کہ اس پر میونک تک پہنچنا مشکل ہے۔ اور یہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بوخم سے چلے تو کار بالکل رواں تھی، بڑے ہنسی خوشی جا رہے تھے، جیسے ہی کولون کے قریب پہنچے اس کا انجن خراب ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور ہم ہائی وے پر کھڑے سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کیا کیا جائے؟ ہائی وے کے قریب دور کچھ مکانات تھے، ہم وہاں گئے، معلوم ہوا کہ قریب میں ایک گیراج ہے اس کے مالک سے بات کی۔ اس سے کہا کہ اتفاق سے ایک حادثہ میں ختم ہونے والی فوکسی کا انجن ہے، تین سو مارک میں لگا دے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ گاڑی کو دھکے دے کر وہاں تک لائے۔ نیا انجن لگا اور ہم پھر میونک کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کے بعد سے گاڑی خراب نہیں ہوئی۔ راستے میں ہم فرینکفرٹ، اور نیورمبرگ دیکھتے ہوئے میونک پہنچے۔

جرمنی میں بویریا کی ریاست اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ سبزہ، درخت، دور پہاڑیوں پر مکانات اور چرچ۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پریوں کی سرزمین پر آ گئے ہوں۔ جرمنی کے بقیہ لوگ بویریا کے لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر یہ خود کو ان سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔ اس کی سرحد میں داخل ہوں تو یہ بورڈ نظر آتا: ”آزاد ریاست بویریا۔“

میونک سے واپس آئے تو عباس زیدی تو لندن چلے گئے، فوکسی ہم نے چار سو مارک میں بیچ دی۔ سوچا کہ دوبارہ سے فیکٹری جائیں مگر پتہ چلا کہ ہمارے ہاسٹل کے ایک ویٹ نامی نے فیکٹری والوں سے شکایت کر دی تھی کہ ہم بیمار نہیں تھے بلکہ گھومنے گئے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے ہمیں ملازمت سے نکال کر ایک ہفتہ کے پیسے دے دیئے۔

اس ملازمت کے علاوہ جرمنی میں ایک آدھ مرتبہ پارٹ ٹائم بھی کیا۔ جرمنوں کا بھی یہ دستور ہے کہ وہ گھریلو اشیاء کی خریداری مہینہ بھر کے لئے کر لیتے ہیں۔ اس لئے شہر سے تھوڑی دور فاصلہ پر ایک بڑا شاپنگ سنٹر ہے، یہاں مہینے کے پہلے سنیچر کے دن بڑی تعداد میں لوگ خریداری کے لئے آتے ہیں اس لئے انہیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو پارکنگ میں ان کی مدد کریں۔ یہ کام طالب علم کیا کرتے ہیں۔ ایک دو بار میں نے بھی یہ کام کیا۔ پیلا اوور کوٹ پہن کر اور ہاتھ میں ایک پلے کارڈ لے کر لوگوں کو پارکنگ کراتے تھے۔ اس میں تفریح بھی ہوتی تھی کہ ایک حصہ میں جگہ ہے مگر کار والے کو اور آگے بھیج دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کسی فرد کے پاس اگر ذرا سی بھی اتھارٹی آ جائے تو وہ اسے استعمال کر کے کس قدر خوش ہوتا ہے۔ یہی ہمارا حال تھا کہ مرضی ہوئی تو ایک حصہ میں کار پارک کرا دی ورنہ آگے بھیج دیا جائے۔

جب سال ختم ہونے کو آیا، تو مجھے پھر مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ نہ تو کمرہ مفت میں رہا اور نہ مہینہ کے ڈیڑھ سو مارک۔ لہٰذا میں سیدھا ہسٹری کے شعبہ میں اپنے دوست ڈاکٹر ایولین کے پاس گیا۔ انہیں اپنی صورتحال بتائی۔ ڈاکٹر ایولین نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ کریں گے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر انہوں نے شعبہ میں مجھے اسسٹنٹ شپ دلا دی۔ اس میں روز چار گھنٹہ شعبہ میں کام کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے لائبریری میں کام شروع کر دیا۔ اس دوران میرے پروفیسر نے دو تین جگہ وظیفے کے لئے بھی درخواستیں دیں۔ کوئی چھ مہینے کے اندر اندر مجھے دو جگہ سے وظیفوں کی پیشکش ہوئی۔ ایک تو ویسٹ فالن حکومت کی طرف سے، اور دوسرا فریڈرش ایبرٹ فاؤنڈیشن کی جانب سے کہ جو سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کا ادارہ ہے۔ اب صورت یہ تھی کہ ٹیوٹر کی حیثیت

سے ڈیڑھ سو مارک ملتے تھے' اسسٹنٹ شپ میں پانچ سو' اور وظیفہ میں آٹھ سو مارک ملنے لگے۔ اتنے پیسہ دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں خرچ کروں۔

یہ 1974ء کی بات ہے۔ اس لئے فیصلہ کیا کہ گھر سے نکلے تین سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے لہٰذا والدین سے جا کر مل لیا جائے۔ لندن سے پاکستان کے لئے سستا ٹکٹ مل جاتا تھا' اس لئے میں پہلے لندن آیا' یہاں کچھ دن رہا اور پھر پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا۔

پاکستان میں جو لوگ یورپ و امریکہ سے واپس آتے ہیں' ان کی بڑی عزت ہوتی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ ان کا سماجی رتبہ بڑھ جاتا ہے۔ ایک زمانہ میں تو لوگ اپنے نام کے ساتھ لندن پلٹ' جرمنی پلٹ یا امریکہ پلٹ لگا لیتے تھے۔ جیسے کہ یہ بھی کوئی ڈگری ہو۔ مگر اب چونکہ بہت لوگ پلٹنے لگے ہیں اس لئے یہ استعمال تو کم ہو گیا' مگر ابھی بھی یورپ و امریکہ جانا عام لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ اس لئے وہاں آنے والوں کی باتیں لوگ حیران و ششدر ہو کر سنتے ہیں۔ ابھی بھی کچھ لوگ اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے کہتے ہیں کہ میں بارہ سال یا پندرہ سال ولایت میں رہا۔ یعنی آپ نے جتنی مدت ولایت میں گزاری اس حساب سے آپ کے درجات بلند ہوتے چلے جائیں گے۔

دوبارہ سے دوستوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس بار والد نے اصرار کیا کہ میں شادی کر کے جاؤں۔ میں نے ایک شرط پر شادی کی حامی بھری وہ یہ کہ اس میں صرف گھر والے ہوں گے اور کوئی رسم و رواج نہیں ہوں گی۔ میری بیوی اور ان کے گھر والے اس زمانہ میں شہداد پور میں رہتے تھے۔ لہٰذا ہم ایک دن شہداد پور گئے اور وہاں سادہ سی تقریب میں شادی کی رسومات ہو گئیں۔ میں کوئی ایک مہینہ حیدر آباد میں رہا۔ اس کے بعد معہ اپنی بیوی کے واپس جرمنی آ گیا۔

گرانڈولے ہاسٹل کو چھوڑنے کے بعد' میں رنکالی ہاؤس رہا' جب شادی ہوئی تو ہارڈنبرگ ہاؤس میں ایک ڈبل روم میں آ گئے۔ کچھ دنوں یونی سنٹر کے ہاسٹل میں رہے۔ ان ہاسٹلوں کی تاریخ بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ ابتداء میں جو ہاسٹل بنے' ان کا مقصد

یہ تھا کہ طالب علموں کو آپس میں ملنے کے مواقع فراہم کئے جائیں تاکہ ان کی کمیونٹی لائف ہو۔ مگر سب 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں یورپ میں طالب علموں کی تحریکیں چلیں اور احتجاج ہوئے تو اتھارٹیز کا رویہ بھی بدل گیا۔ اس لئے یونی سنٹر میں جو نئے ہاسٹل بنے، ان میں ہر کمرہ میں کچن اور دوسری سہولیات تھیں۔ طالب علم ایک مرتبہ جب کمرے میں آ جاتا تو اسے کسی اور سے ملنے کا موقع ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے کئی طلبہ نے کہا کہ انہیں ایک ایک ہفتہ کسی سے بات کرے ہو جاتا ہے۔ ان ہاسٹلوں میں خودکشی کی وارداتیں بھی بڑھ گئیں تھیں۔ ان اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ طالب علموں کے درمیان باہمی رابطوں کو کم کیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ یونی سنٹر کے ہاسٹل میں ہم کچھ عرصہ رہے، پھر ہمیں فلیٹ کی تلاش ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں بچہ ہونے والا تھا اور اس کے ساتھ ایک کمرہ میں گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔

یونیورسٹی سے تھوڑے فاصلہ پر ایولین باؤم اسٹراسے پر یونیورسٹی کی جانب سے شادی شدہ لوگوں کے لئے فلیٹ تھے۔ ہم نے وہاں درخواست دی۔ پتہ چلا کہ یہ فیصلہ کہ فلیٹ کس کو دیا جائے گا، وہاں کی یونین کرتی ہے۔ لہٰذا ہم یونین کے عہدیداروں کے سامنے پیش ہوئے اور اپنا کیس ان کے سامنے پیش کیا۔ ہمارے علاوہ دو درخواست گزار اور تھے۔ مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا مگر اس شرط پر کہ ہم یونین کا ساتھ دیتے ہوئے اس اسٹرائک میں شریک رہیں گے کہ جو وہ بڑھتے ہوئے کرایہ کے خلاف کئے ہوئے ہیں لہٰذا نئے کرایہ کے بجائے ہم پرانا کرایہ ادا کریں گے۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہم نے ان کی شرائط مان لیں اور نئے فلیٹ میں اٹھ آئے۔

فلیٹ کے لئے کچھ سامان تو ایک پولش پروفیسر سے خریدا کہ جو واپس اپنے وطن جا رہا تھا۔ باقی جو کچھ بچا تھا وہ فٹ پاتھ سے حاصل کیا۔ جرمنی میں یہ دستور ہے کہ گھر میں جو فالتو اشیاء ہوتی ہیں وہ لوگ مہینہ کے ایک دن فٹ پاتھ پر رکھ دیتے ہیں اب جس کا جی چاہے یہاں سے اپنی پسند کی چیز لے جائے۔ باقی جو بچ جاتی ہیں انہیں کارپوریشن کی گاڑی اٹھا کر لے جاتی ہے لہٰذا ان میں بہت کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

میزیں، کرسیاں، قالین اور الماریاں وغیرہ۔ مونی اس سلسلہ میں بڑا کباڑیا تھا، وہ یہاں سے چیزیں اٹھاتا ان کی مرمت کرتا اور استعمال کے قابل بناتا تھا۔

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں جرمن یونیورسٹیاں سیاسی طور پر بہت سرگرم عمل تھیں۔ بائیں بازو کی تحریکیں بڑے زوروں پر تھیں۔ ویت نام کی جنگ نے ان تحریکوں کو مقصدیت دے دی تھی۔ نظریاتی طور پر یہ تحریکیں کئی حصوں، جماعتوں اور گروپوں میں تقسیم تھیں ان سب سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ یونیورسٹی کا مینزا تھا۔ یہاں کے بڑے ہال میں ہر گروپ نے اپنا اسٹال لگایا ہوتا تھا۔ کمیونسٹ لٹریچر میزوں پر سجا ہوا ہوتا تھا۔ میگافون ہاتھ میں لئے ہر کونے میں تقریریں ہو رہی ہوتی تھیں۔ جلسے، جلوس اور اسٹرائکیں خوب ہوتی تھیں۔ مگر یونیورسٹی کا شیڈول نہیں بدلتا تھا۔ کلاسیں اسی طرح سے ہوتی تھیں۔ جذبات کے اظہار کے لئے یونیورسٹی کی دیواریں تھیں۔ لاتعداد پوسٹر اور ہینڈ بلز چھپا کرتے تھے اور خوب تقسیم ہوتے تھے۔ اس ماحول میں طالب علموں کی سیاسی تربیت اچھی طرح سے ہو جاتی تھی۔

طالب علموں کی ان تحریکوں نے جرمنی میں بھی یونیورسٹی کے کردار کو بدلنے میں حصہ لیا۔ اس سے پہلے جرمن یونیورسٹیاں روائتی اور قدامت پرست ہوا کرتی تھیں۔ پروفیسر و طالب علم سوٹ اور ٹائی میں رہتے تھے۔ زبان کے استعمال میں بھی ادب آداب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مگر اب یہ سب روایات ٹوٹ گئیں۔ طالب علم و استاد ایک دوسرے کو "تو" سے مخاطب کرتے تھے، "آپ" کا استعمال متروک ہو گیا، پرانے پروفیسروں کے علاوہ نوجوان استاد عام لباس میں آتے تھے۔

یونیورسٹی کے معاملات میں طالب علموں کا عمل دخل ہو گیا ہے۔ اگر پروفیسر کا تقرر ہوتا ہے یا پروموشن تو اس میں شعبہ کے طلبہ کی رائے شامل ہوتی ہے ہمارے ہاں پروفیسر بوسے نے جب بوخم چھوڑا اور کیل یونیورسٹی چلے گئے۔ تو ان کی جگہ پروفیسر شپ کے لئے تین امیدوار تھے۔ ان تینوں نے پہلے لیکچرز دیئے۔ اس کے بعد فیکلٹی اور شعبہ کی طلبہ یونین نے فیصلہ کیا کہ کون اس عہدے کے لئے اہل ہے۔

جرمنی میں پروفیسری کا ملنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے

پی ایچ ڈی کی جائے۔ ڈاکٹریٹ کے بعد وہ کسی پروفیسر کا اسسٹنٹ ہو کر اس کے ساتھ ایک اور ریسرچ کا کام کرتا ہے اور تھیسس لکھتا ہے، جس کے بعد ہی وہ پروفیسر ہو سکتا ہے۔ پروفیسری کا تھیسس لکھ کر بھی وہ پروفیسر نہیں ہوتا بلکہ اسے پرائیویٹ لیکچرار کہا جاتا ہے۔ اس کا تقرر اس یونیورسٹی میں نہیں ہوتا کہ جہاں سے اس نے یہ امتحان پاس کیا ہے بلکہ یہ تقرر کسی اور یونیورسٹی میں ہونا چاہئے اس طویل بیورو کریٹک چکر کی وجہ سے پروفیسر بننے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔

جرمنی میں ڈاکٹریٹ کرنے والے اور پروفیسر کی بڑی عزت ہے۔ اس کا تجربہ مجھے بھی اس وقت ہوا کہ جب میں نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانا شروع کیا۔ آفس، ہوٹل اور خریداری میں یہ اس کا اثر جادوئی ہوتا تھا۔ ہر شخص ڈاکٹر کا سن کر فوراً" عزت کرنے لگتا تھا۔ اس لئے جرمنی میں جو پی ایچ ڈی کرتے ہیں، وہ خود کو ڈاکٹر کہلواتے ہیں۔ بلکہ جو دو پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں وہ ڈاکٹر، ڈاکٹر کہلاتے ہیں۔

اساتذہ کی یہ عزت ایسے ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں ان کے کام اور ان کے کارنامے ہیں۔ جرمن یونیورسٹیوں اور اس کے اساتذہ نے جرمنی کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اور جرمنی کے ہر بحران کے وقت جو مدد کی ہے، اس کی وجہ سے ان کی عزت و وقار ہے۔ جرمنی کی سیاست میں یونیورسٹی کے اساتذہ کا بڑا اہم حصہ ہے۔ اس کے اکثر وزیر اور چانسلر و صدر پروفیسر ہوتے ہیں۔

جرمنی کا تعلیمی نظام انگلستان سے بالکل مختلف ہے۔ سمسٹر سسٹم کی ابتداء جرمنی سے ہی ہوئی تھی اور سیمینار کا طریقہ بھی جرمنوں کی ایجاد ہے۔ پورے سمسٹر طالب علم لیکچر و سیمینار میں شریک ہوتے ہیں، مختلف موضوعات پر لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، ان کا آخری امتحان زبانی ہوتا ہے۔ پہلے سے مقرر نصاب نہیں ہوتا ہے، بلکہ پروفیسر ہر سمسٹر میں اپنا نصاب بناتا ہے۔ ڈاکٹریٹ کرنے والے کو تھیسس کے علاوہ تین مضامین میں اور امتحان دینا ہوتا ہے۔ جب امیدوار اپنا تھیسس مکمل کر لیتا ہے تو یہ فیکلٹی میں تین ہفتہ کے لئے رکھ دیا جاتا ہے اس کا اعلان ایک سرکلر کے ذریعہ ہوتا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے پڑھے اور اپنی رائے دے۔ زبانی امتحان دو گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ اس میں

ممتحن اور فیکلٹی کے ممبران ہوتے ہیں۔ کافی کا دور چلتا رہتا ہے اور سوالات ہوتے رہتے ہیں۔ امتحان کا نتیجہ فورا" بتا دیا جاتا ہے اور امتحان پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ اسی وقت دے دیا جاتا ہے مگر اصل ڈگری اس وقت ملتی ہے کہ جب تھیس چھپ جائے۔

یہاں جو تحقیقی مقابلہ کا نگران ہوتا ہے' اسے ڈاکٹر فاٹر' یعنی "ڈاکٹر باپ" کہتے ہیں وہ اپنے طلبہ کے ساتھ اسی شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں کہ جیسے اپنے بچوں سے۔ ڈاکٹر بوسے کا یہ مشفقانہ رویہ میرے ساتھ رہا' ایک آدھ بار جب ہم باہر تفریح کے لئے گئے تو میرے کھانے کے پیسے انہوں نے ہی ادا کئے۔ اپنی اکثر تصانیف بھی مجھے بطور تحفہ دیں۔ جرمنی کی یہ روایت بھی ہے کہ جب پروفیسر کسی دوسری یونیورسٹی جاتا ہے تو اپنے ساتھ اپنے اسسٹنٹ اور ریسرچ کے طالب علموں کو ساتھ لے کر جاتا ہے۔ پروفیسر بوسے جب ہمبرگ یونیورسٹی سے آئے تو پورا شعبہ ان کے ساتھ بوخم آگیا۔ جب وہ بوخم سے کیل گئے تو یہی ہوا۔ میں ان کے ساتھ اس لئے نہیں گیا کہ میرا بوخم میں دل لگ چکا تھا' اور میں کیل میں نئے سرے سے زندگی شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں اپنی تحقیق کے سلسلہ میں لندن جاتا رہتا تھا کہ جہاں میں نے برٹش میوزیم لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں کام کیا۔ 1975ء میں ہم نے ایک چکر اور لگایا' اس بار میرے ساتھ ذکیہ' میری بیوی اور عطیہ میری بیٹی ساتھ میں تھی۔ عطیہ ابھی چھوٹی تھی۔ اس لئے اسے ساتھ لئے لئے پھرتے تھے۔ اس بار میں نے بھی لندن کو بطور سیاح دیکھا۔ ایک بار ہم ظفر مسعود کے پاس' جو میرے کالج کے زمانہ کے ساتھی ہیں' پیرس گئے۔ دو یا تین بار ہالینڈ جانا ہوا۔

بوخم کا شہر جہاں روھر یونیورسٹی ہے' ایک چھوٹا شہر ہے' مجھے چھوٹے شہر اس لئے اچھے لگتے ہیں کہ یہاں زندگی پرسکون ہوتی ہے۔ ٹرانسپورٹ کے مسائل نہیں ہوتے ہیں' ایک جگہ سے دوسری جگہ پیدل آجا سکتے ہیں۔ یونیورسٹی نئی نئی تھی۔ اس کے ہاسٹل قریب ہی تھے کہ جہاں پیدل جایا جا سکتا تھا۔ جب یونی سنٹر بنا تو طالب علموں کے لئے اور سہولت ہو گئی کیونکہ یہاں شاپنگ سنٹرز' سینما' ہوٹل' کتابوں کی دکانیں' سب ہی کچھ تھا۔ ذرا شہر سے باہر نکل جائیں تو جنگل' کھیت اور سبزہ تھا۔ اگرچہ روھر کا علاقہ

صنعتی علاقہ ہے، مگر ہمارے لئے تو یہ بھی انتہائی خوبصورت تھا۔

میں نے جرمنی میں تقریباً پونے پانچ سال گزارے۔ اس عرصہ میں جرمن زبان سیکھ چکا تھا اور ان میں گھل مل گیا تھا۔ جہاں تک یونیورسٹی کے ماحول کا تعلق تھا، وہاں اساتذہ اور طالب علموں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن شہر میں اور عام لوگوں سے ملنے جلنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ جرمنوں میں غیر ملکیوں کے بارے میں بڑے تعصبات ہیں۔ اندر سے یہ زبردست قسم کے نسل پرست ہیں، اور خود کو برتر سمجھتے ہیں، اس لئے یہاں جو بھی غیر ملکی ہیں، جن میں ترکی، یوگوسلاویہ، اور یونان کے مزدور ہیں، ان کے خلاف نفرت ہوتی ہے۔ بلکہ اب تو یہ جذبات اور زیادہ ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ کام کے دھنی ہیں۔ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں، جب ان سے پوچھے کہ کیا حال ہیں تو جواب ہوتا ہے کہ "بہت کام ہے" (Viel Arbeit)۔ اس کے ساتھ ہی قاعدہ و قانون کے زبردست پابند ہیں۔ اسی لئے لینن نے ایک بار جرمنوں کے لئے کہا تھا کہ اگر یہ کبھی ریلوے سٹیشن پر حملہ کرنے کا ارادہ کریں گے تو پہلے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدیں گے۔ جرمنوں کی ایک کہاوت ہے کہ "قانون' قانون ہوتا ہے" اس لئے اگر قانون کی خلاف ورزی کسی مجبوری کے تحت ہی کی جائے اس کو یہ نہیں مانیں گے۔ قانون کے سامنے انسانی مجبوری، یا ضروریات کی کوئی حیثیت نہیں ہے جس کے ذمہ جو کام لگا دیا جاتا ہے اور بتا دیا جاتا ہے کہ اسے ایسے کرنا ہے، تو وہ مشین کی طرح بغیر سوچے سمجھے اس پر عمل کرے گا۔ فرض کی اس ادائیگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

سردیوں میں ایک بار ہم ایک جرمن دوست کے ہمراہ پیرس گئے۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ واپسی میں جب ہم فرانس کی سرحد پر آئے تو وہاں امیگریشن والوں نے آفس سے اشارہ کر دیا کہ جاؤ، اس کڑاکے سردی میں انہوں نے باہر آنے کی زحمت نہیں کی۔ یہی بلجیم کی سرحد پر ہوا۔ وہ بھی اپنے آفس سے باہر نہیں آئے۔ میں نے اپنے جرمن دوست سے کہا کہ جرمنی کی سرحد پر یہ نہیں ہو گا۔ وہ ضرور ہمارے پاسپورٹ چیک کرے گا اور ہوا بھی یہی۔ وہاں کے امیگریشن افسر نے

تمام پاسپورٹ دیکھے۔ پھر جانے دیا۔

کبھی کبھی یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ رات کے وقت جب ٹریفک بالکل نہیں ہے مگر پیدل چلنے والے اس وقت سڑک عبور کرتے تھے کہ جب یہ نشان آ جاتا تھا ورنہ کھڑے انتظار کرتے رہتے تھے۔

آفسوں میں اس وجہ سے بیوروکریسی کا بڑا عمل دخل ہے۔ ہر کام آہستہ اور پیچیدگی سے ہوتا ہے۔ کاغذ پر جب تک ٹھپہ نہیں لگے، اس وقت تک وہ مکمل نہیں ہوتا ہے۔ قانون کی ان پابندیوں کی وجہ سے ڈسپلن تو ہے، مگر اس سے فرد کی آزادی بہت گھٹ گئی ہے۔ ہر بات میں انتہا پسندی ہے۔

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس بات کی کوششیں ہوئیں کہ جرمنی میں جمہوری روایات اور قدروں کو فروغ دیا جائے مگر جرمنوں میں اتھارٹی کا رعب اس قدر ہے کہ وہ وفاداری اور اطاعت گزاری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ کسی جرمن کی زندگی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ وہ وفادار اور قانون کو ماننے والا ہے۔

کام کے مشغلہ کے بعد، ان کا دوسرا شوق صفائی کا ہے۔ خاص طور سے گھریلو عورتیں ہر وقت گھر کی صفائی میں مصروف رہتی ہیں۔ فرش صاف ہے مگر پھر بھی اس کو رگڑ رہی ہیں۔ اس صفائی کی وجہ سے جرمن شہر یورپ کے شہروں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔

آجکل یورپ کے اور ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی چھٹیوں پر جانے کا بڑا شوق ہو گیا ہے۔ اس کے لئے سال بھر انتظار کرتے ہیں اور پھر دھوپ میں لیٹ کر خود کو براؤن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب 1972ء میں واپسی کا پروگرام بنا تو میرے پاس ایک تو پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی اور دو بیٹیاں جو یہاں پیدا ہوئیں تھیں۔ جانے سے پہلے جو ضروری سامان تھا اسے جہاز سے بک کرایا۔ جس دن آنا تھا، اس دن گھر صاف کر کے بستر پر وہی چادریں بچھائیں۔ کچن میں دھلے برتنوں کو سلیقہ سے رکھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرائے اور گھر کو اس طرح سے چھوڑ کر آئے کہ جب دوسرا رہنے آئے تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔

بوخم سے فرینکفرٹ تک ہانس لے کر آیا، ہانس سے پرانی دوستی تھی۔ یہ دائیں بازو کی طلبہ ایک جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ فزکس میں ڈگری لے کر اب میڈیسن پڑھ رہا تھا۔ یہ ہر وقت مدد کے لئے تیار رہتا تھا۔ گھر شفٹ کرنا ہو، پردے لگانا ہوں، بجلی کا کام ہو، ہانس ہر کام کے لئے موجود ہوتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی سی موٹر سائیکل بھی تھی جس پر گرمیوں میں گھومتا تھا۔ یہ ہمیں فرینکفرٹ تک لایا۔ آخری بار ایک دوسرے سے گلے ملے اور جرمنی کو الوداع کہتے ہوئے ائیرپورٹ میں داخل ہوئے۔

جب ہمارا جہاز قاہرہ کے قریب پہنچا تو ذکیہ کہنے لگی کہ غضب ہو گیا میں اپنے سونے کے کڑے اور دوسرے زیور الماری پر رکھ کر بھول آئی۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں جلدی یاد آگیا، جہاز کو واپس لئے چلتے ہیں اور زیورات لے کر آتے ہیں، کیا خیال ہے؟ افسوس کہ اس وقت تک بوخم میں ائیرپورٹ نہیں تھا۔

☆

سندھ یونیورسٹی اور لاہور

ستمبر کا مہینہ اور 1972ء کا سال تھا کہ ہم جرمنی سے واپس پاکستان آئے۔ کراچی ایئرپورٹ پر آئے تو ایک افراتفری کا عالم تھا۔ بڑی مشکلوں سے سامان لیا۔ باہر آئے۔ سخت گرمی تھی۔ حبس علیحدہ سے، وہاں سے چلے تو حیدر آباد۔ حیدر آباد کا حال کراچی سے زیادہ خراب تھا۔ سڑکیں نہ صرف یہ کہ ٹوٹی ہوئی تھیں بلکہ غائب تھیں اور ان میں گہرے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ بجلی کی سپلائی اپنی مرضی کی تھی۔ سوچا کہ حالات تو خراب ہیں مگر رہنا بھی یہیں ہے۔

دوسرے دن صبح صبح یونیورسٹی گیا تاکہ ملازمت جوائن کروں۔ اس وقت ہسٹری کی چیئرپرسن حمیدہ کھوڑو تھیں۔ ان سے یعقوب مغل نے ملاقات کرائی جوائن رپورٹ پر ان کے دستخط لئے اور رجسٹرار کے آفس بھجوا دی۔

مجھے تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے آنے سے شعبہ کے لوگ پریشان ہو جائیں گے، لیکن کافی لوگوں کو میرا واپس آنا اور پھر آسانی سے میرا اس طرح جوائن کرنا اچھا نہیں لگا۔ لہذا خاموشی سے سازشیں ہونے لگیں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ تنخواہ ملنی شروع ہو تاکہ ہم گھر کا خرچہ چلائیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے اس میں تین چار مہینے لگ جاتے ہیں۔

حمیدہ کھوڑو اگرچہ شعبہ کی سربراہ تھیں مگر تھیں اپنی مرضی کی مالک۔ جب مرضی

ہو آتیں تھیں ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ ایاز تھے‘ جو کہ سندھی کے مشہور شاعر اور دانشور ہیں‘ جب دو مہینہ گزر گئے تو کسی نے کہا کہ شیخ صاحب سے جا کر ملو اور ان کی خدمت میں اپنا حال احوال کہو‘ شاید کہ رحم آ جائے اور تمہاری تنخواہ مقرر ہو جائے۔ دینے والے نے مشورہ دیا کہ شیخ صاحب کا دربار روز شام کو وی سی ہاؤس میں لگتا ہے‘ شام کا وقت ہوتا ہے۔ شیخ صاحب مصاحبوں کی محفل میں عالم سرور میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ وقت مناسب ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت احمد سلیم ان کے قریب ہیں۔ کیونکہ انہیں شیخ صاحب نے یونیورسٹی اس لئے بلایا ہے کہ وہ ان کے کلام کا پنجابی میں ترجمہ کریں۔

احمد سلیم سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ فورا” تیار ہو گئے شام کو وی سی ہاؤس کے باہر ملنے کا وقت طے ہوا۔ حیدر آباد سے جام شورو آنا ایک مصیبت ہے کیونکہ ٹرانسپورٹ کا انتظام انتہائی ناقص ہے۔ مگر میں پبلک بس پکڑ کر پہنچا۔ احمد سلیم کو وی سی کے اسٹاف والے جانتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ سات بجے شام کو دروازہ کھلا‘ شیخ صاحب سو کر اٹھے تھے دروازے سے ایک نگاہ ڈال کر دیکھا کہ کون کون بیٹھا ہے۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ ہم سب حاضرین دم بخود‘ خاموشی سے ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب شیخ صاحب نہا دھو کر آئے تو سب نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ احمد سلیم نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے ادب کے ساتھ اپنے تھیسس کی ایک کاپی جو چھپ چکی تھی ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے پلٹ کر ادھر ادھر سے دیکھا پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ نے تاج محل دیکھا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جی نہیں!“

بولے: ”پھر مغلوں پر بغیر تاج محل دیکھے کیسے کتاب لکھ دی۔“

سوچا کہ کہوں کہ غلطی ہوئی‘ لیکن اب تو ایسا ہو گیا‘ اس کے بعد ان کی توجہ دوسرے امور پر ہو گئی‘ میں مصاحبوں کے درمیان آدھ گھنٹہ باادب بیٹھا رہا‘ پھر اجازت چاہی اور دوبارہ سے بس پکڑ کر واپس حیدر آباد آیا۔

اس ملاقات کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ اس عرصہ میں یہ کوششیں ہوئیں کہ کس طرح مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ بعد میں حمیدہ کھوڑو کو بھی بڑا افسوس ہوا کہ انہوں نے میری جوائننگ رپورٹ کیوں سائن کر دی۔ اس کی وجہ سے اب لوگ مجبور تھے کہ مجھے برداشت کریں۔

سلسلہ چلتے چلتے دسمبر آ گیا۔ ایک دن یونیورسٹی میں تھا کہ فون آیا کہ وی سی آپ کو بلاتے ہیں۔ میں خوش ہوا کہ شاید میرے معاملات طے ہو جائیں گے۔ سندھ یونیورسٹی کا کیمپس جس انداز سے بتایا گیا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ آرٹس فیکلٹی سے ایڈمنسٹریشن کی عمارت تک پیدل جانے کے لئے بیس منٹ چاہئیں۔ یہ فاصلہ ویرانے سے ہو کے طے کرنا ہوتا ہے۔ یہ کارنامہ بھی غلام مصطفیٰ شاہ کا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اساتذہ و طلبہ کو انتظامیہ سے دور رکھو۔ بہرحال میں ہانپتا ہوا وی سی کے آفس پہنچا۔ پہلے ان کے پی اے کے کمرہ میں بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد طلبی ہوئی۔ شیخ صاحب کے چہرے پر دانشوری کی روشنی سے زیادہ جاگیردارانہ رعونت تھی۔ میں نے مئودبانہ سلام کیا' جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ جب انہوں نے نہیں کہا تو میں خود بیٹھ گیا۔ میز پر سے نظریں اٹھا کر بڑی ناراضگی سے بولے: "آپ کو جتنے دن کی چھٹی دی گئی تھی اس سے زیادہ وقت لگا کر آپ آئے ہیں۔"

میں نے کہا: "درست ہے مگر وجہ یہ تھی کہ میں کسی وظیفہ پر نہ تھا۔ وہاں محنت مزدوری کی اور پڑھا' اس میں دیر لگی۔ اگر وقت پر آ جاتا تو پی ایچ ڈی نامکمل رہ جاتی۔"

کہنے لگے: "ہمیں آپ کی پی ایچ ڈی سے کوئی مطلب نہیں' آپ کو ہر حالت میں وقت پر آنا تھا۔"

میں نے کہا: "اگر آپ میری بات نہیں سمجھتے اور اس پر توجہ نہیں دیتے تو آپ کے ساتھ مزید گفتگو بے کار ہے۔" خدا حافظ۔

میں یہ کہہ کر اٹھ کر چلا آیا۔

دوسرے دن وی سی صاحب کا ایک خط ملا کہ چونکہ آپ نے وی سی کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اس لئے آپ کو ملازمت سے معطل کیا جاتا ہے۔ یہ معطلی جو شروع ہوئی تو اس نے ختم ہونے کا نام نہیں لیا۔ اس زمانہ میں یہ بھی تجربہ ہوا کہ لوگ اتھارٹی سے کس قدر ڈرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں، میں اکثر شعبہ فلسفہ میں جایا کرتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر عطاء الرحیم اور فریدالدین میرے دوستوں میں سے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد ایک دن جو گیا تو ان کے صدر شعبہ کہنے لگے کہ مبارک صاحب ذرا یہاں آنے میں احتیاط کریں۔ یونیورسٹی میں ٹیچرز یونین یا کسی نے میرے حق میں نہ کوئی آواز اٹھائی نہ میری مدد کی یہ معطلی کا یہ زمانہ میں نے انتہائی پریشانی میں گزارا۔ دوستوں سے قرضہ لے کر گزارا کیا۔ جب مہینہ بھر کے لئے قرضہ مل جاتا تھا تو میں مطمئن ہو جاتا تھا کہ چلو ایک مہینہ تو گزر جائے گا۔ ستمبر سے لے کر جون 1977ء تک اسی حالت میں وقت گزرا۔ ایک دن میرے دوست وکیل قریشی نے کہا کہ صوبائی وزیر تعلیم پیر آفتاب جیلانی ان کے دوست ہیں، لہٰذا ان سے سفارش کراتے ہیں۔

وزیر صاحب سے ملنے کے لئے کراچی گئے۔ شکر ہے کہ وہ وکیل قریشی کو نہ صرف پہچان گئے بلکہ عزت کے ساتھ پیش آئے۔ ہمیں دوسرے دن اپنے آفس میں بلایا کہ وہاں سے وہ شیخ ایاز کو فون کریں گے۔ وزیر کے آفس میں جانے اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ بھی میرے لئے ایک تجربہ تھا۔ ان کے آفس میں پچاس کے قریب لوگ ہوں گے کہ جو ان کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ وزیر کے جاننے والے تھے، کچھ سفارشی خطوط لے کر آئے تھے۔ ان کے اردگرد دو ٹیلی فون تھے جس پر دو آدمی بیٹھے اس شخص کا نمبر ملانے میں مصروف تھے کہ جن سے سفارش کرنا ہوتی تھی۔ ان میں کوئی تبادلہ کرانا چاہتا تھا، کوئی نئی ملازمت کا خواہش مند تھا تو کوئی میڈیکل کالج یا انجینئرنگ کالج میں داخلے کے لئے کوشاں تھا۔ وزیر صاحب کو کسی سے انکار نہیں تھا۔ وہ خوش قسمت ہوتا تھا کہ جس کا مطلوبہ نمبر مل جاتا تھا۔ اب پتہ نہیں کہ کام ہوتا تھا یا

نہیں۔ لیکن سفارش ہر ایک کی جاتی تھی۔ ہماری سیاست میں یہ سرپرستی نہ ہو تو ووٹ کیسے ملیں۔ شیخ صاحب بڑی دیر میں ملے۔ انہوں نے نہ جانے فون پر میرے بارے میں کیا کہا، لیکن کہا کہ اسے بھیج دو، میں اس سے بات کروں گا۔ اس ساری کاروائی میں پورا ایک دن بیت گیا۔

دوسرے دن میں حیدر آباد سے وی سی صاحب سے ملنے گیا۔ کمرے میں بلایا تو دیکھا کہ کوئی کتاب پڑھنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ میرے آنے کی بھی انہیں خبر نہیں ہوئی۔ میں نے سلام کیا تو سر اٹھا کر دیکھا۔ کہنے لگے: "پیر صاحب میرے دوست ہیں، انہوں نے سفارش کی ہے تو میں تمہیں دوبارہ سے رکھ لیتا ہوں۔"

میں نے کہا: "جناب کا شکریہ۔"

کہنے لگے: "مگر تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔ ایک معافی نامہ لکھ دو، باقی سنڈیکیٹ سے میں کرا لوں گا۔"

میں نے کہا: "کیسا معافی نامہ۔"

بولے: "یہی کہ تم نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔"

"مگر میں نے تو کوئی بدتمیزی نہیں کی۔"

"بھئی ٹھیک ہے، مگر یہ معافی نامہ نہیں ہو گا تو بات مجھ پر آئے گی کہ تمہیں کیوں معطل کیا۔"

میں نے کہا: "یہ آپ کا دردِ سر ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق، اور اگر معافی نامہ دینا ہوتا تو یہ شروع ہی میں دے دیتا۔"

کہنے لگے: "افوہ! تم سے تو بات کرنا مشکل ہے۔ بھئی میں تمہارا وائس چانسلر ہوں، تم سے بڑا ہوں، کیا تم میری بات نہیں مانو گے۔"

میں نے کہا: "یہاں تو نہیں۔"

پھر بولے: "اچھا تمہارا کوئی دوست ہے کہ جس سے بات کی جائے اور تمہیں سمجھائے۔"

"مرزا امجد بیگ، ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس کو میرے پاس بھیج دو، میں ان سے بات کروں گا۔"

میں نے یہ پیغام مرزا صاحب تک پہنچا دیا۔ اس عرصہ میں دوستوں نے کہا، یار دے دو معافی نامہ کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے کہا بھائی فرق تو پڑتا ہے، انسان اندر سے ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسرے دن مرزا صاحب نے کہا کہ اچھا ایک درخواست لکھ دو کہ کن وجوہات کی وجہ سے تم وقت پر نہیں آئے اور ایک جملہ یہ کہ: "میرا مقصد وی سی کی بے عزتی کرنا نہیں تھا۔"

یہ درخواست لکھی گئی۔ شیخ صاحب نے درخواست جیب میں رکھی اور سنڈیکیٹ میں کہا کہ مبارک نے معافی مانگ لی ہے اس لئے اسے دوبارہ سے ملازمت پر بحال کر دیا جائے۔ جب میں نے سنا تو غصہ آیا کہ لوگ کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں۔ سنڈیکیٹ نے فیصلہ کیا کہ مجھے بحال تو کر دیا جائے مگر میرا معطلی کا پیریڈ بغیر تنخواہ کے ہو گا۔

اگرچہ ان شرائط پر ملازمت کرنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا مگر دوستوں کے اصرار پر یہ کرنا پڑا۔ جب میں نے ملازمت جوائن کر لی، اور میری تنخواہ ملنے لگی، تو میں نے سنڈیکیٹ میں اپیل کی کہ میرے معطل کے پیریڈ کی تنخواہ دی جائے۔ سنڈیکیٹ میں جسٹس چنہ بھی ہوا کرتے تھے، ان کے ریمارکس تھے کہ ہم نے اس کو ملازمت دے دی، یہ بہت ہے۔ اب یہ پیسے بھی مانگتا ہے۔ لہٰذا میرا کیس رد ہو گیا۔

اس کے بعد میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ عدالت میں جاؤں۔ یہاں دوست وکیل کام آئے۔ منور علی قاضی میرے کالج کے زمانہ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے مقدمہ دائر کر دیا۔ شیخ صاحب کو یہ بہت برا لگا۔ اس دوران یونیورسٹی کا کوئی وکیل نہیں تھا اس لئے اس مقدمہ کی خاطر ایک وکیل رکھا گیا۔ مگر عدالت جانے کی نوبت اس لئے نہیں آئی کہ اسی دوران سنڈیکیٹ کے الیکشن ہونا تھے، اس میں قاضی آصف ایک امیدوار تھے، انہوں نے کہا اگر وہ جیت گئے تو وہ میرا کیس

سنڈیکیٹ سے پاس کرا دیں گے۔ ہمارے دوستوں نے انہیں ووٹ دیئے۔ جیتنے کے بعد حسب وعدہ انہوں نے میرا کیس سنڈیکیٹ سے جسٹس چنہ صاحب کی موجودگی میں پاس کرایا، یوں مجھے معطلی کے زمانے کے بقایا جات ملے۔

کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی میں ہسٹری کے شعبہ کو تقسیم کر کے جنرل اور مسلم ہسٹری کر دیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ جب امیر حسن اور محمود حسین آئے تو دونوں کو صدر شعبہ بنانا تھا۔ لہذا اس کا حل یہ نکالا کہ ہسٹری کو مسلم و جنرل میں تقسیم کر دیا جائے۔ میں جرمنی گیا ہوں تو اس وقت تک سندھ میں بھی یہ تقسیم باقی تھی۔ لیکن بعد میں جب طلبہ کی تعداد گھٹی تو دونوں شعبوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ میں واپس آیا تو پھر اس بات کی کوششیں ہوئیں کہ ان کو علیحدہ کر دیا جائے۔ لیکن اسی دوران ایک واقعہ اور پیش آیا۔ میں نے ایک کمرے میں بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ کوشش یہی تھی کہ لوگوں سے الگ تھلگ رہا جائے اور کچھ کام کیا جائے۔ کوئی ایک ہفتہ ہی گزرا ہو گا کہ اطلاع ملی کہ میرے خلاف ایک درخواست وی سی اور ڈین کو دی گئی ہے۔ یہ زمانہ ضیاء الحق کا تھا، درخواست میں کہا گیا کہ ”ڈاکٹر مبارک علی نے اس کمرے میں رکھی ہوئی مذہبی کتابوں کو جلا دیا ہے۔“ ان مذہبی کتابوں میں طبری کی تاریخ اسلام، ابن کثیر اور دوسرے مصنفین کے نام تھے۔ اس سے پہلے کہ میری پیشی وی سی کے پاس ہو یہ معاملہ حمیدہ کھوڑو کے سامنے پیش ہوا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی حمایت میں صرف ایک بات کہوں گا وہ یہ کہ کتابیں جلانے کا کام مذہبی لوگوں نے کیا ہے، غیر مذہبی لوگ یہ کام نہیں کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ قصہ یہاں ختم ہو گیا مگر مجھے وہ کمرہ چھوڑنا پڑا، اس کے بعد سے میں نے پاکستان اسٹڈی کی لائبریری میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ یہ میرے لئے مفید ثابت ہوا، کیونکہ یہاں میں نے اپنی آئندہ کتابوں کے لئے مواد جمع کیا۔

جب ضیاء الحق صدر بنے اور اس کے کچھ مہینوں بعد ہی انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کی جو عملی کوششیں کیں، تو اس کا سب سے پہلا اثر شیخ ایاز پر ہوا۔ شیخ صاحب

کی مدت ملازمت پوری ہو رہی تھی، مگر وہ ہر حالت میں وی سی رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے حکومت کی خوشنودی کے لئے انہوں نے اپنے کمرے سے باہر نماز باجماعت کا انتظام کیا چونکہ ان کا پیٹ کافی نکلا ہوا ہے اس لئے ان کے لئے علیحدہ سے ایک چوکی رکھی گئی کہ جہاں شیخ صاحب سب کے سامنے نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ اس پر بس نہیں ہوا، بلکہ مولانا صلاح الدین جو اس وقت جسارت کے ایڈیٹر تھے ان کی شاندار دعوت کی گئی اور ان کی ایک کتاب جو شاید حقوق انسانی اور اسلام پر تھی اس کی کاپیاں خرید کر یونیورسٹی کے تمام شعبوں کو بھیجی گئیں۔ شیخ صاحب نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ وہ مولانا مودودی کی کتاب ترجمان القرآن کا سندھی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن شیخ صاحب کی یہ ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ کیونکہ ایک دن آرٹس فیکلٹی کے سامنے طلبہ نے مظاہرہ کیا۔ ان کے خلاف پولیس کو بلایا گیا کہ جس نے آنسو گیس پھینکی اور طلبہ کو فیکلٹی کی بلڈنگ میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اس پر یونیورسٹی کے اساتذہ نے احتجاج کیا اور سب مل کر آرٹس فیکلٹی سے وی سی کے آفس تک پیدل گئے۔ وہاں سب کو سینٹ ہال میں بٹھایا گیا۔ اس دوران حیدر آباد ریجن کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی آ گئے۔ اس محفل میں ایک کے بعد ایک استاد نے کھڑے ہو کر سب کے سامنے شیخ صاحب کو برا بھلا کہا۔ یہاں دلچسپ باتیں ہوئیں۔ مثلاً ایک استاد نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے کہا کہ کیا آپ بینک کے منیجر کو فوج میں جنرل بنا دیں گے؟ اگر نہیں تو ایک ایسے شخص کو کیوں وی سی بنایا ہے کہ جس نے خود کبھی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔ شیخ صاحب کی بدعنوانیوں اور نالائقیوں کی تمام تفصیلات ایک ایک کر کے پیش ہوئیں۔ مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ اور قطعی یہ نہیں کہا کہ وہ اس وقت احتجاجاً" مستعفی ہوتے ہیں۔ وہ خود تو مستعفی نہیں ہوئے مگر انہیں مزید توسیع نہیں دی گئی اور وہ اس حالت میں یونیورسٹی سے گئے کہ کسی نے انہیں الوداعی تقریب بھی نہیں دی بلکہ ایک عرصہ تک ان کی شاعری پر یونیورسٹی میں طلبہ نے پابندی لگائے رکھی۔

اس کے بعد سے میرا شیخ صاحب سے کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ نہ ہی میں کبھی ان سے ملا۔ لیکن بعد میں جب میری کتابیں چھپیں اور میری شہرت ہوئی۔ تو سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میرے معاملہ میں ان سے غلطی ہوئی۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں بھی میرا ذکر اچھا ہی کیا ہے۔ اب سنا ہے کہ واقعی شیخ صاحب پکے و سچے مسلمان ہو گئے ہیں۔

میرا پروموشن بھی آسانی سے نہیں ہوا۔ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تو اس لئے بن گیا کیونکہ حادثاتی طور پر میرے شعبہ کے ساتھی ابصار عالم صاحب اچانک وفات پا گئے۔ ان کی وجہ سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اس پر میرا تقرر ہو گیا۔ لیکن جب مجھے شعبہ کا صدر بنانے کا سوال آیا تو اس وقت کے وی سی جو ہماری یونیورسٹی کے پرانے پروفیسر تھے۔ مسٹر ابڑو' جنہیں شیخ ایاز نے بھٹو کے زمانہ میں معہ پانچ یا چھ اساتذہ کے نکال دیا تھا۔ یہ مجھے صدر بناتے ہوئے ہچکچا رہے تھے مگر مجبوری یہ تھی کہ میرے علاوہ اور کوئی تھا نہیں انہوں نے ایک دن مجھے آفس بلایا۔ میں جب سے کہ شیخ صاحب نے اپنے آفس بلایا تھا اس وقت سے وی سی کے آفس جاتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ بہرحال یہ پرانے جاننے والے تھے۔ کہنے لگے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر لڑنے کیوں لگے ہو۔ میں تمہیں شعبہ کا صدر بناتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ٹھیک سے کام کرو گے۔

ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو ابھی بھی ہمارے شعبہ میں پروفیسر تھیں مگر وہ بہت کم آتی تھیں۔ اس لئے نہ تو کلاس لیتی تھیں اور نہ ہی کسی کو ریسرچ وغیرہ کراتی تھیں۔ شیخ ایاز نے انہیں کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ تنخواہ پوری ملتی تھی۔ ابڑو صاحب کا تعلق شعبہ معاشیات سے تھا' اس لئے وہ اس فیاضی کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ وہ جتنے دن یونیورسٹی آئیں گی' اتنے ہی دنوں کی تنخواہ ملے گی۔ بغیر درخواست غیر حاضری' فرائض سے لاپروائی' یہ اور اس قسم کے کوئی چارجز ان پر نہیں لگے۔ کیونکہ ان کا تعلق جس طبقہ سے ہے وہ قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کی

سزا تو ہم جیسے لوگوں کو بھگتنی ہوتی ہے اس لئے کھوڑو صاحب کو کبھی ایک دن کی تنخواہ ملتی تھی تو کبھی چار پانچ دن کی۔ پروفیسری انہوں نے بھی نہیں چھوڑی۔

جب مظہر صدیقی صاحب وی سی ہو کر آئے تو انہوں نے بھی کھوڑو صاحب کے سلسلہ میں کوئی ایکشن نہیں لیا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اچانک انہیں خیال آیا کہ وہ سیاست میں عملی حصہ لیں۔ اس میں دقت یہ تھی کہ حکومت نے پابندی لگا رکھی تھی کہ ملازمت کے دو سال تک کوئی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ سنا ہے کہ ضیاء الحق نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے لئے اس شرط کو ختم کرا دیں گے۔ یعنی یہ صدر کا استحقاق تھا کہ وہ جس کو چاہے اجازت دے دے اس لئے اچانک ایک دن حمیدہ کھوڑو صاحبہ آئیں، وی سی سے ملیں اپنا استعفیٰ دیا، اور میرے پاس اپنا ڈرائیور بھیجا کہ میں انہیں یہ لیٹر دے دوں کہ ان کے ذمہ شعبہ کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ جلدی میں ہو گیا مگر ہوا یہ کہ صدر نے ان کے لئے اس شرط میں نرمی نہیں کی۔ اس لئے انہوں نے فوراً" جی ایم سید کی جئے سندھ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔

ان کے استعفیٰ دینے سے جو پروفیسر شپ خالی ہوئی اس پر میرا تقرر ہو گیا۔

جب میں جرمنی سے واپس آیا تو میں نے فرید صاحب اور دوسرے دوستوں سے مل کر اپنے بے نام علمی و ادبی کلب کو دوبارہ سے زندہ کیا۔ اس کی نشستیں اب دیال داس کلب میں ہوتی تھیں۔ ان نشستوں میں، میں باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ پڑھتا تھا۔ جب میرے پاس کافی مضامین جمع ہو گئے تھے۔ کوشش کی کہ انہیں چھپوایا جائے۔ مگر اس وقت کوئی پبلشر انہیں چھاپنے پر تیار نہیں ہوا۔ اس سے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ چھوٹے شہروں میں رہنے والوں کو کس قدر مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ چونکہ وہاں پبلشر نہیں ہوتے اس لئے ان کی چیزیں نہیں چھپتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے سوچا کہ اپنا ادارہ بنا کر اس کے تحت کتابیں چھاپیں۔ چنانچہ "آگہی" کے نام سے یہ پبلشنگ ادارہ قائم کیا۔ میری پہلی کتاب "تاریخ کیا ہے؟" اس ادارے کی جانب سے چھپی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کو فروخت کیسے کیا جائے۔ جن صاحب نے تقسیم کی ذمہ داری لی تھی وہ غائب

ہو گئے۔ اس لئے ایک کام تو یہ کیا کہ حیدر آباد کی دکانوں پر خود جا کر کتابیں رکھوائیں۔ اس کے بعد طالب علموں نے ذمہ داری لی کہ وہ اسے بیچیں گے۔ اس کتاب کے چھاپنے سے بہت کچھ سیکھا۔ اگرچہ پروف بار بار دیکھا' مگر کمپوزر نے انہیں درست نہیں کیا اس لئے بہت غلطیاں رہ گئیں اس لئے اس بار میں نے سوچا کہ اپنی آئندہ کتاب خود کتابت کروں اور پھر اسے چھپواؤں۔ چنانچہ بٹر پیپر اور لکھنے کے لئے خاص قلم اور سیاہی خریدی اور اپنے کچھ مضامین "تاریخ اور شعور" کے نام سے چھاپے۔ خیال تھا کہ اگر کتاب میں کوئی جان ہو گی تو بک جائے گی ورنہ دوستوں میں تقسیم کر دیں گے۔

میری توقع کے برخلاف یہ کتاب بہت جلد مقبول ہو گئی۔ خاص طور سے اس میں "بہشتی زیور" پر جو مضمون تھا' اسے سب ہی نے پسند کیا۔ پہلی بار میرے پاس لوگوں کے اس قدر خطوط آئے کہ اس کے بعد اور کسی کتاب پر نہیں آئے۔ یہ 1982ء کی بات ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ ضیاء الحق کا مارشل لاء اور اس کی گھٹن تھی کہ لوگوں کا ردعمل اس قدر شدید ہوا۔ مگر ساتھ ہی میں یہ بھی ہوا کہ کچھ کتب فروشوں نے اس کتاب کو رکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ مثلاً میں کراچی میں کتاب محل' جو صدر میں واقع تھی' وہاں گیا تو اس کے مالک نے اس کی فہرست دیکھ کر کہا کہ "نہیں صاحب یہ ہم نہیں رکھ سکتے۔"

میں نے لاکھ کہا کہ اصل ذمہ دار تو میں ہوں' مگر اس نے کہا کہ وہ بلا وجہ مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس سے میری ہمت افزائی ہی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے "آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان"، "سندھ کی تاریخ کیسے لکھنی چاہئے۔" اور "تاریخ کے نظریات" کی کتابت کی۔ ان کتابوں کے ٹائٹل خدا بخش ابڑو نے بنائے۔ اور ان کی فروخت میں دوستوں اور طالب علموں نے مدد کی۔ اسی زمانہ میں یہ بھی تجربہ ہوا کہ کتب فروشوں سے پیسے وصول کرنا کس قدر مشکل ہے۔ اکثر نے تو پیسہ نہیں دیئے۔ ان میں لاہور کا ایک مشہور بک فروش بھی ہے کہ جس کے بارے میں یہ شہرت ہے کہ

وہ کسی کو پیسے دینے کے قائل نہیں ہیں۔

سندھ کی تاریخ پر میں نے جو تھوڑا بہت لکھا اس کا سندھ کے نوجوانوں پر اثر ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ضیاء الحق کے دور میں سندھ جس احساس مظلومی کا شکار تھا اس میں شناخت کا احساس زبردست طاقت بن کر ابھرا۔ 1983ء میں جب ایم آر ڈی کی تحریک چلی تو سندھ سندھ کے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں نوجوانوں میں خصوصیت سے سیاسی بیداری آ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ان سالوں میں، میں سانگھڑ، دادو اور لاڑکانہ لیکچر دینے گیا۔ نوجوانوں میں سیاسی صورتحال کو سمجھنے کا بڑا شوق اور جذبہ تھا۔ رات رات بھر بیٹھے بحث کرتے رہتے تھے۔ ان نوجوانوں نے جگہ جگہ لائبریریاں قائم کی تھیں۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ ان حالات نے مجھے بہت زیادہ پرامید کیا، اس لئے میں نے اس زمانہ میں کافی لکھا۔

لیکن جب 1986ء میں ایم کیو ایم کا زور ہوا تو سندھ کی سیاست جو اب تک ترقی پسندی کے نظریات کے تحت آگے جا رہی تھی، اب اس میں سندھی، مہاجر سوال آ گیا اور وہ سارا سیاسی ماحول بدل گیا۔

سندھ یونیورسٹی میں، میں 1963ء سے 1970ء تک، پھر 1976ء سے 1989ء تک رہا۔ یہ چھ سال میرے باہر رہنے کے ہیں۔ اس طرح میری ملازمت کی مدت 26 سال بنتی ہے۔ یونیورسٹی کی اس پوری ملازمت میں، اور اس وقت بھی کہ جب میں پروفیسر اور صدر شعبہ تھا یونیورسٹی نے مجھے کبھی بھی کسی اہم ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھا۔ کسی کمیٹی میں نہیں رکھا۔ کسی کو میرے ساتھ پی ایچ ڈی نہیں کرنے دیا کیونکہ دو ایک امیدواروں نے جو موضوع لئے تھے انہیں یونیورسٹی نے اجازت نہیں دی۔ میرے شعبہ میں طلبہ کی تعداد بھی کم ہوتی تھی اور جو ہوتے تھے انہیں تعلیم سے کم ہی دلچسپی تھی۔ ان حالات میں میرے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ کتابیں لکھوں اور ان تک اپنے خیالات پہنچاؤں کہ جو ان کو جاننا چاہتے ہیں۔

فروری 1985ء کی بات ہے کہ مجھے لاہور سے سوسائٹی برائے فروغ تعلیم، جس

کے ڈائریکٹر ڈاکٹر حامد قزلباش ہیں' ایک خط ملا کہ میں ان کی سوسائٹی میں آکر لیکچر دوں۔ سندھ سے باہر نکلنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ میں اور میرے ساتھ عیسٰی داؤد پوتہ دونوں لاہور آئے۔ اس بار میں تقریباً سترہ سال بعد لاہور آیا تھا' اس لئے پورا شہر بالکل نیا اور اجنبی لگا۔ اس لیکچر میں لاہور کے تقریباً تمام مشہور دانشور شریک تھے اور ان سے میرا تعارف اسی لیکچر کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد سے لاہور میں' میرے اس قدر دوست بنے کہ حیدر آباد کے بعد یہ میرا دوسرا شہر ہو گیا۔

یہیں انور کمال نے میرا تعارف مصطفیٰ وحید سے کرایا کہ جو "نگارشات" کی جانب سے کتابیں چھاپتے تھے۔ انہوں نے میری کتابیں چھاپنے کی حامی بھری۔ میری ابتدائی کتابیں مصطفیٰ وحید ہی نے چھاپیں اور خود انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ ان کے پبلشنگ ہاؤس کے فروغ میں میری کتابوں کا بہت حصہ ہے لیکن بعد میں رائلٹی کے مسئلہ پر ان سے اختلافات ہوئے تو میں نے مزید ان سے کتابیں چھپوانا بند کر دیا۔

سندھ یونیورسٹی سے میرا دل ایک واقعہ کے بعد اچاٹ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک طالب علم کو جو پورے سمسٹر میں کبھی کلاس میں نہیں آیا تھا' وہ امتحان کے لئے فارم بھجوانا چاہتا تھا کہ جو میرے لئے مشکل تھا۔ اس وقت اگر طالب علم کو اس قسم کی مشکل پیش آتی تھی تو وہ کسی طالب علم رہنما کو لے آتے تھے۔ ایک دن جب کہ میں اپنے شعبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ جیئے سندھ کا ایک رہنما معہ چند ساتھیوں کے میرے کمرے میں آیا اور میز پر مکہ مار کر کہنے لگا کہ: "تو کون ہوتا ہے جو اس کے فارم کو بھیجنے سے انکار کرتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے دو چار اور مکے میز پر مارے اور کہا کہ خبردار اگر اسے امتحان سے روکا۔

میں اس صورتحال کے لئے قطعی تیار نہیں تھا اور اب تک اس غلط فہمی میں تھا کہ یونیورسٹی کے تمام طالب علم میری عزت کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے واقعات پیش آ چکے تھے کہ جب اساتذہ کو

مارا پیٹا گیا تھا۔ گالیاں دی گئیں تھیں اور کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ ان تمام واقعات میں اساتذہ کو کسی نے نہیں پوچھا تھا اور نہ کسی نے احتجاج کیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر نہ تو یونیورسٹی کو میری ضرورت ہے اور نہ طالب علموں کو، تو پھر یونیورسٹی میں رہنا فضول ہے۔ یہ بھی مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ اگر یونیورسٹی میں رہنا ہے تو ذلیل و خوار ہو کر رہنا ہو گا۔ کیونکہ اس واقعہ کا علم سب کو ہو گیا تھا۔ مگر کسی نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

پھر انہیں دنوں یعنی 80ء کی دہائی میں حیدر آباد کے حالات خراب ہو چکے تھے، روز کرفیو لگتا تھا، گولیاں چلتی تھیں، ہروقت اعصابی تناؤ، کام کرنے کے مواقع کم سے کم ہو رہے تھے۔ یہ وہ حالات تھے کہ ایک تو انور کمال نے اصرار کیا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر لاہور آ جاؤں، دوسرے یونیورسٹی اور شہر کے حالات نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔

اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر انصاری سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ اگر ہو سکے تو مجھے ساؤتھ ایشیا ایریا اسٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر بھیج دیں تاکہ میں وہاں چند سال رہ کر کچھ کام کر لوں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں میری مدد کی اور پنجاب یونیورسٹی کو میرے ڈیپوٹیشن کے لئے لکھا۔ ان کے اس یقین دہانی پر کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں میں 1989ء میں لاہور شفٹ ہو گیا۔ یہاں بھی میرے ساتھ توقعات کے برخلاف برتاؤ ہوا۔

میں ایک دن اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سے ملنے گیا تو اول تو انہوں نے کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرایا، پھر ملے، ادھر ادھر کی باتیں کیں اور بس۔ دوسری مرتبہ کوئی گھنٹہ بھر انتظار کرایا اور کہنے لگے کہ آپ اپنی کتابیں دیں تاکہ ہم پڑھ کر فیصلہ کریں۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہ کتابیں میں کیوں دوں۔ آپ کی لائبریری میں ہیں۔ وہاں سے منگوا کر پڑھ لیجئے۔ یہ سن کر جھلا کر بولے "پھر ایسے تو کام نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا کہ اگر نہیں ہو گا تو رہنے دیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ چونکہ ڈاکٹر مبارک کے نظریات خراب ہیں، اس لئے یونیورسٹی میں ہنگامہ ہو جائے گا۔ لٰہذا وہاں بھی میرے لئے راستے بند ہو گئے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ بہتر ہے کہ میں یونیورسٹی چھوڑ کر کچھ اور کام کروں۔

اب جب میں سندھ یونیورسٹی گیا اور کہا کہ میرے 26 سال ہیں، لٰہذا میں ریٹائرمنٹ لینا چاہتا ہوں، تو پتہ چلا کہ اس میں سے پانچ سال اس لئے نکال دیئے گئے کہ وہ میرا پی ایچ ڈی کا پیریڈ تھا اور یہ چھٹی مجھے بغیر تنخواہ کے ملی تھی۔ لٰہذا میری ملازمت گھٹ کر 21 سال رہ گئی۔ میں نے اس کے خلاف سنڈیکیٹ میں اپیل کی کہ اس سال 26 لوگ وظیفے پر گئے تھے۔ انہیں تین سال کی تنخواہ بھی ملی تھی۔ ہم سے بونڈ ایک جیسا بھروایا تھا۔ لٰہذا اب فرق کیوں؟ سنڈیکیٹ نے فیصلہ کیا کہ قانون قانون ہے اس میں کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے جو نقصان اٹھانا پڑا، اس کا اثر میری پوری زندگی تک رہے گا۔ پی ایچ ڈی کرنے کی جتنی سزا میں نے بھگتی ہے یا کم ہی لوگ اس سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

لاہور میں ایک سال کے قریب میں نے مشعل میں کام کیا۔ یہ ایک پبلشنگ ادارہ ہے کہ جو انگریزی سے اردو میں تراجمہ کرا کے چھاپتا ہے۔ ابھی میں یہاں ہی ملازمت کر رہا تھا کہ ایک دن گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور سے فون آیا کہ اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیرر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ ہم ایک سیمینار "آمریت اور معاشرہ" پر کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں آپ کی شمولیت ہونی چاہیے۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ پی ایچ ڈی میں نے جرمنی ہی سے کی ہے اس کے بعد گفتگو جرمنی زبان میں ہوئی۔ فوراً ہی مجھ سے کہنے لگا کہ لاہور میں ڈائریکٹر کی پوسٹ خالی ہے، کیا یہاں آنا پسند کرو گے۔ میں نے سوچا کہ فوراً ہاں نہیں کہنی چاہیے، اس لئے کہا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔

جب سوچا اور دوستوں سے مشورہ کیا تو سب ہی نے کہا کہ اس سے اچھی اور کیا

بات ہو گی۔ شیرر کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ میونک میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے مرکزی دفتر کو اس کے لئے آمادہ کرنا تھا کہ وہ ایک غیر جرمن کو ڈائریکٹر بنا دیں۔ ان کی تاریخ میں اب تک ایسا ہوا نہیں تھا' اس لئے ان کی جانب سے سخت مزاحمت تھی۔ مگر ساتھ ہی مسئلہ یہ تھا کہ شیرر کراچی اور لاہور دونوں کو سنبھال نہیں سکتا تھا اور جرمن ڈائریکٹر بہت مہنگا پڑتا اور اس لئے کئی مہینوں کے بعد وہ راضی ہوئے اور اپریل 1991ء میں' میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں آ گیا۔

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً ساڑھے چار سال کی ملازمت میں بڑے تجربے ہوئے۔ اول تو یہ میرے ڈائریکٹر ہونے پر جرمنوں اور پاکستانیوں' دونوں کو دھچکہ لگا۔ پاکستانیوں کا خیال تھا کہ ڈائریکٹر جرمن ہی ہونا چاہئے۔ جرمنوں کا خیال تھا کہ جرمن انسٹی ٹیوٹ میں جرمن نسل کا آدمی زیادہ موزوں ہے لیکن میری وجہ سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان کے دانشوروں میں سے اکثر میرے دوست ہیں' لہٰذا میں نے انسٹی ٹیوٹ کو ان سے روشناس کرایا اور ان لوگوں نے جب بھی ضرورت ہوئی انسٹی ٹیوٹ کے پروگراموں میں مدد کی۔ اس وجہ سے انسٹی ٹیوٹ کے پروگراموں کا معیار بڑھ گیا۔

اب تک لاہور میں جرمنی ڈائریکٹروں کا تعلق امراء اور طبقہ اعلیٰ کے لوگوں سے ہوتا تھا اور انسٹی ٹیوٹ میں پروگرام بھی اس قسم کے ہوتے تھے۔ ان میں خصوصیت سے ان طبقہ کی لڑکیاں اور عورتیں جرمن ڈائریکٹروں سے تو مرعوب رہتی تھیں مگر انہیں ایک مقامی شخص سے بات چیت میں ہمیشہ دقت رہی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاتون آرٹسٹ نے اپنی پینٹنگز کی نمائش کے لئے وقت مانگا۔ اس زمانہ میں ہمارا اپنا شیڈول ایسا تھا کہ جس میں وقت نہیں تھا۔ ناراض ہو کر کہنے لگیں کہ آپ کا کراچی کا ڈائریکٹر کون ہے' اس سے بات کروں گی۔ انہوں نے شیرر سے بات کی اور مجھ سے آ کر کہا کہ اس نے تاریخ دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی یہاں کا ڈائریکٹر میں ہوں۔ اب آپ کی نمائش نہیں ہو گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور اسے کراچی کا ڈائریکٹر بھی نہیں بدلوا سکتا۔ اس پر وہ سخت ناراض ہوئیں اور میرے خلاف جرمن سفارت

خانہ کو خط لکھا۔

اسی دوران ایک اور واقعہ اجوکا تھیٹر کی مدیحہ گوہر کے ساتھ ہوا اجوکا تھیٹر گوئٹے میں ریہرسل کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے لوگوں کا رویہ ہمارے اسٹاف کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کا ہوا کرتا تھا۔ جس کی شکایت اسٹاف کے لوگ آ کے کرتے تھے۔ مگر میں انہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیتا تھا۔ ایک دن ہمیں ہال میں استقبالیہ دینا تھا۔ وہاں اجوکا والے ریہرسل کر رہے تھے۔ جب میں نے مدیحہ سے کہا کہ آج وہ ریہرسل نہیں کرے کیونکہ ہال کی ہمیں ضرورت ہے تو وہ غصہ میں اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے برا بھلا کہہ کر چلی گئی۔ اس نے اس پر بس نہیں کی، بلکہ کراچی ڈاکٹر شیرر کو فون کیا کہ میں نے اسے ریہرسل نہیں کرنے دی۔ جب میں نے یہ سنا تو میں نے اجوکا کو انسٹی ٹیوٹ سے نکال دیا اور کہا کہ وہ یہاں آئندہ نہ آئیں۔

جب ڈاکٹر شیرر لاہور آئے تو میں نے اسے پورا واقعہ سنایا اور کہا اسے اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ انسٹی ٹیوٹ مجھے چلانا ہے۔ اس لئے اس نے مدیحہ سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس معاملہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا اور اگر اسے گوئٹے میں آنا ہے تو مبارک سے معافی مانگے۔ اس کے بعد مدیحہ میرے پاس آئی، معافی مانگی اور دوبارہ سے انسٹی ٹیوٹ میں آنے لگی۔

میرا تجربہ یہ ہوا کہ ہمارے معاشرے میں اب تک گورے لوگوں کا بڑا رعب ہے اور عام طور پر اس کا شکار ہمارا طبقہ امراء اور اس کی خواتین ہیں۔ کیونکہ جب بھی میں جرمنوں کے ساتھ کسی محفل میں گیا، لوگوں کی ساری توجہ انہیں کی طرف ہوتی تھی اور ان کی خوشامد میں سب پیش پیش رہتے تھے۔ اس لئے مجھے یہاں رہتے ہوئے دو قسم کے تعصبات سے واسطہ پڑا ایک اپنے لوگوں سے اور دوسرا جرمنوں سے۔ جو مجھے اپنے برابر کا درجہ دینے پر تیار نہ تھے۔ اس کی ایک مثال جنوبی ایشیا کے ڈائریکٹرز کی کانفرنس ہے۔ جو عام طور پر انڈیا میں ہوتی ہے۔ 1992ء میں جب یہ میٹنگ ہوئی تو اس میں مجھے دعوت نامہ نہیں ملا اس پر ڈاکٹر شیرر نے سخت احتجاج کیا اور بعد میں اس

نے بتایا کہ تمہیں اس لئے نہیں بلایا تھا کہ تم جرمن نہیں ہو۔

گوروں کے مقابلہ میں یہ احساس کمتری پاکستان ہی میں نہیں، انڈیا میں بھی ہے۔ ہم ایک سیمینار کے سلسلہ میں بنگلور گئے ہوئے تھے۔ اشیش نندی، جو کہ انڈیا کا مشہور اسکالر ہے، اس نے کہا کہ چونکہ آکسفورڈ یونیورسٹی نے اس کی کتابیں چھاپی ہیں، لہٰذا وہ ہمیں پندرہ فیصد رعایت پر کتابیں دلا دے گا۔ میں نے دو یا تین کتابیں منتخب کیں اور لا کر کاؤنٹر پر دیں وہ خاتون جو وہاں تھی اس نے ابھی رسید بنانا شروع کی تھی کہ ڈاکٹر شیرر نے آٹھ یا دس کتابیں لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ وہ خاتون فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ میں یہ ہی کر سکتا تھا کہ احتجاجاً وہاں سے چلا آؤں اور کتابیں نہ خریدوں۔

میں اب تک تین مرتبہ ہندوستان گیا۔ مگر ہر مرتبہ مجھے ٹونک کا ویزا نہیں ملا اس لئے میں اپنی خواہش کے باوجود وہاں نہیں جا سکا۔ مگر مجھے وہاں جاتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے کیونکہ میرے ذہن میں ٹونک کا جو نقشہ ہے وہ یقیناً اسے دیکھ کر ٹوٹ جائے گا۔ پاکستان و ہندوستان کے درمیان جو تعلقات ہیں۔ اس کا خمیازہ عام لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ویزا کی اس قدر مشکلات ہو گئی ہیں کہ ہندوستان جانا جوئے شیر کے مترادف ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ ہندوستان گیا تو یہ گوئٹے کی طرف سے ایک سیمینار تھا کہ جس کا ایک سیشن کراچی اور دوسرا بنگلور میں ہونا تھا۔ جب میں نے اسلام آباد میں ویزا کی درخواست دی تو انکار ہو گیا بلکہ ویزا دے کر انہوں نے اسے کاٹ دیا لیکن جب کراچی میں ہماری ملاقات انڈیا کے کونسل جنرل سے ہوئی کہ جو سیمینار میں آیا ہوا تھا تو اس نے کہا کہ وہ ہمیں سب کو ویزا کراچی سے دے دے گا۔ چنانچہ ہم کراچی سے بمبئی گئے جہاں ایک دن ملا تھا، اس میں بمبئی گھوما، پھر بنگلور گئے اور بنگلور سے دہلی۔

میں نے اب دہلی کے بارے میں صرف پڑھا تھا، اس لئے پہلا کام یہ کیا کہ دہلی کی ساری تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوئیں مگر کم۔ اس کے بعد 1992ء میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نے اکبر کی 450 ویں سالگرہ منائی اور اس میں مجھے بھی مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ میرے مقالہ کا عنوان تھا "اکبر پاکستان

کی نصابی کتابوں میں" اس سیمینار میں ہندوستان سے تیس یا چالیس اسکالر تھے جو کہ مغل تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ہم تو ان کے مقابلہ میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ اس کے ایک سیشن کی صدارت مجھ سے کرائی۔ یہیں پر میری ملاقات عرفان حبیب صاحب سے ہوئی۔ اس کے بعد مجھے یہ موقع ملا کہ میں فتح پور سیکری اور تاج محل دیکھ سکوں۔

1995ء میں جب میں ان ایک سو ارکان کے ساتھ ہندوستان گیا کہ جو دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر بنانے کے سلسلہ میں ہندوستان گئے تھے۔ تو میں ایس ایچ آر کے دفتر دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ اس دوران ان کے ایک ڈائریکٹر نے بتایا کہ جب مجھے اکبر والے سیمینار میں بلانے کی دعوت دی گئی تو انڈین سی آئی ڈی نے آپ کو ویزا دینے کی مخالفت کی تھی۔ میرے لئے خوش خبری تھی کیونکہ جب کسی ملک کی خفیہ سروس والوں کو آپ پر اعتبار نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اعتبار کے لائق ہیں۔

ان تینوں مرتبہ مجھے کئی دانشوروں اور عام لوگوں سے ملنے کا موقع ملا کہ جو دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ویزے کی پابندیوں نے عام لوگوں کو آنے اور جانے سے روک رکھا ہے۔ مجھے ایسے لاتعداد لوگ ملے کہ جن کی خواہش ہے کہ وہ کم از کم ایک بار اپنے سابق وطن کو دیکھ جائیں۔ ان کے ذہنوں میں بھی اب تک ان کے پرانے شہروں اور گاؤں کی یادیں باقی ہیں۔ کئی بار ہوا جب میں نے بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں تو وہ ایک دم جذباتی ہو کر بولے: "لاہور، ہم بھی وہیں سے آئے ہیں۔" اور پھر وہ اپنے لاہور کے بارے میں باتیں شروع کر دیتے تھے۔ ویزا کی مشکلات نے دونوں طرف کے لوگوں کے رشتوں کو کاٹ رکھا ہے۔

☆

واپسی

بس تیزی سے جا رہی تھی۔ گرمی کوئی زیادہ نہیں تھی۔ اگرچہ مئی کا مہینہ تھا، مگر ہوا ٹھنڈی تھی، میرے ساتھ سیٹ پر عبدالمعبود اور روبینہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مسافروں سے بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا یہ اتنے سارے لوگ ٹونک جا رہے ہیں۔ یہ 1952ء کے بعد میرا واپسی کا سفر تھا۔ میرے ذہن میں وہی نقشہ بار بار آ رہا تھا۔ کیا ٹونک اس طرح سے ہو گا؟ اگر بدلا ہو گا تو اب کیسا ہو گا مگر پھر بھی تبدیلی کے نیچے تہوں میں چھپی ہوئی بنیادیں تو رہتی ہیں۔ مگر میرا اب وہاں کون ہے؟ چند دور کے رشتہ دار جنہیں دیکھے ہوئے آدھی صدی گزر گئی۔ ان بچھڑوں سے مل کر کیا خوشی ہو گی یا صدمہ؟ ان سے ملا بھی جائے یا نہیں؟ یا بس اپنے شہر کو دیکھ لیا جائے۔ اور اس حسرت کو پورا کر لیا جائے کہ اپنا آبائی وطن ایک بار اور دیکھ لیا۔

بس چلی جا رہی تھی، سڑک کے دونوں جانب درختوں کی قطاروں میں راجستھان کی پتھریلی اور خشک زمین آباد دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں جب میں بس میں یا ریل میں بیٹھتا ہوں تو اس کی رفتار میری پرانی یادوں کو جگا دیتی ہے۔ جب میں باہر کے نظاروں سے تھک جاتا ہوں اور آنکھیں بند کر کے سیٹ کا سہارا لیتا ہوں تو میرے ذہن میں یادیں یلغار کرنا شروع ہو جاتی ہیں۔

میں نے سوچا تبدیلی تو لازمی ہے کوئی چیز ٹھہری ہوئی نہیں رہتی ہے۔ شہر بستے ہیں، بستیاں اجڑتی ہیں، لوگ ملتے ہیں اور بچھڑتے ہیں۔ اجنبی دوست بنتے ہیں اور رشتہ دار اجنبی ہو جاتے ہیں۔ زندگی کو اس طرح سے گزارنا سیکھنا چاہیے۔ یہ دل میں

غم و حسرت اور صدمہ کس بات کا۔ مگر میں نے کہا، تبدیلی لازمی ہے۔ مگر یہ ہماری زندگیوں میں یہ تبدیلی کیوں غم و اندوہ کے سوا اور کچھ نہیں لاتی۔ یقیناً ہجرت ہمارے خاندان کا مستقل وطیرہ رہا۔ اس کا بوجھ ہمیشہ دو یا تین نسلوں نے تو اٹھایا ہو گا۔ شاید ہمارے بعد آنے والی نسلیں ہجرت کے اس اذیت ناک دور سے دور ہوں اور اس صدمہ کو محسوس نہ کریں کہ جو جدائی میں ہوتا ہے۔

اور پھر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تبدیلی تو شہروں کا خاصہ ہے۔ یا تو شہر تباہ ہو کر کھنڈرات کی شکل میں چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر بے تحاشہ بڑھنے لگتے ہیں۔ جب ٹونک چھوڑ کر ہمارا خاندان حیدر آباد سندھ میں آباد ہوا تھا، تو ہم نے اس شہر کو کس قدر صاف ستھرا اور پر سکون پایا تھا۔ اور جب ہم لطیف آباد میں گئے تو وہاں کس قدر خاموشی تھی، مکانوں کے آگے لوگوں نے باڑھیں لگا رکھی تھیں، چھوٹے چھوٹے لان تھے۔ سڑک پر درخت تھے اور جب رات کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں تو زندگی کا مزہ آ جاتا تھا۔ لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی خاموشی سے شہر میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ مگر وہ تبدیلیاں میرے سامنے آئی تھیں اور آہستگی سے ہو رہی تھیں۔ اس لئے ہم نے بہت زیادہ محسوس نہیں کیا لیکن جب میں 1970ء میں باہر چلا گیا اور 74ء میں 76ء میں واپس آیا تو حیدر آباد کو دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ شہر میں کوئی کھلی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ باغوں کی جگہ دکانیں و فلیٹس بن گئے تھے۔ ٹریفک کا اژدھام اس قدر کہ پیدل چلنا دشوار، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر، ہم لطیف آباد نمبر10 میں ایک کرایہ کے مکان میں آ کر رہے تھے، جب بارش ہوتی تو گھر کے سامنے اس قدر پانی جمع ہو جاتا کہ پندرہ روز تک گھر سے نکلنے کا راستہ بند ہو جاتا تھا۔ سڑک پار کرنے کے لئے جوتے اتارنا پڑتے تھے۔ اس لئے بارش سے نفرت ہو گئی تھی۔ جب بھی آسمان پر کالے کالے بادل آتے تو دل دھڑک جاتا کہ اگر یہ برس گئے تو راستے بند ہو جائیں گے۔ جب ہمارے وہاں رہتے ہوئے بالاخر گلی کی سڑک بنی تو بڑی خوشی ہوئی کہ اب برسات کے بعد گھر میں قید ہو کر نہیں رہیں گے بلکہ روزمرہ کی طرح گھر سے نکل سکیں۔ اس وقت احساس ہوا کہ ہماری حالت کیا ہو گئی ہے کہ اگر گلی کی سڑک بن جائے اور نالیاں ٹھیک

ہو جائیں تو ہم اپنے دوسرے مسائل بھول کر حکومت کے مشکور ہو جاتے ہیں۔

اور کتنے دنوں کی بات ہے۔ ہم نے 1989ء میں حیدر آباد چھوڑا اور لاہور آئے مگر جب بھی میں حیدر آباد جاتا ہوں اسے بدلا ہوا پاتا ہوں۔ پہلے سے زیادہ گندا، پرشور اور دلکشی سے محروم۔ لسانی فسادات نے شہر کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ اب یہ شہر سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان تقسیم ہو گیا ہے۔ ہر طرف دکانیں اور فلیٹس بن رہے ہیں۔ سڑکیں کھدی پڑی ہیں۔ ٹریفک کا شور ہے۔ اور وہ حیدر آباد کی تازہ و خوشگوار ہوائیں اب اپنا راستہ بدل چکی ہیں۔ شہر اگرچہ آباد ہے مگر میرے لئے وہ ویرانہ ہے۔ میرے اکثر دوست و احباب اس شہر کو چھوڑ کر جا چکے ہیں جو ہیں وہ سراپا احساس محرومی کا شکار، میں جب بھی جاتا ہوں تو چند محبت کرنے والے جمع ہو جاتے ہیں، شہر کے حالات پر تبصرہ ہوتا ہے، پچھلی یادیں دہرائی جاتی ہیں۔ میری ہمت نہیں ہوتی کہ میں شہر میں پھر کر پرانی جگہوں کو تلاش کروں۔ میرے لئے یہ شہر جب بھی جاتا ہوں پہلے سے زیادہ اجنبی ہو جاتا ہے۔

یکدم بس رکی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دور دور تک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ بس جہاں رکی تھی وہ کوئی قصبہ تھا۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا: ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”چاکسو۔“

”چاکسو، یہ تو وہی جگہ ہے کہ جہاں میں ایک بار اپنے والد کے ساتھ ان کے دوست کی شادی میں آیا تھا، اور رات مندر میں گزاری تھی۔ پھر درختوں کے سایہ میں پیپل کے پتوں پر کھانا کھایا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی کہ شاید وہ مندر نظر آ جائے یا وہ درختوں کے جھنڈ۔ مگر بس جلدی میں تھی، میں نے جاتے جاتے اس کی تنگ گلیوں کو دیکھا۔ جہاں بچے کھیلتے نظر آئے۔ دکانوں پر نظر پڑی کہ جہاں لوگ جمع تھے۔ اس کے بعد بس پھر اس آبادی سے نکل آئی اور پھر وہی ویرانہ اچانک دور کسی پہاڑی پر کوئی قلعہ نظر آ جاتا تھا۔ راجستھان کی سرزمین لڑاکو اور جنگجو راجپوتوں کی دھرتی ہے۔ یہ ماضی میں آپس میں لڑتے رہے، اور اپنی بہادری اور شجاعت پر ناز

کرتے رہے۔ اس لئے جب ان قلعوں پر نظر پڑتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ قلعہ سے بھاری بھاری پگڑیاں باندھے' ہتھیاروں سے مسلح راجپوتوں کے دستے پر دستے چلے آ رہے ہیں۔ فضا میں جنگی نعروں کا شور اور تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر جب آنکھیں کھولیں تو دور دور تک خاموشی تھی۔ قلعہ بھی پہاڑی پر ساکت ماضی کی یادوں کو سمیٹے خاموشی سے کھڑا تھا۔ بس تیزی سے چلی جا رہی تھی اور اسی تیزی سے میری یادیں ذہن میں آ رہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہر تبدیلی اذیت ناک نہیں ہوتی ہے۔ یہ خوشگوار بھی ہوتی ہے۔ میں نے لندن میں ڈیڑھ سال اور بوخم میں ساڑھے چار سال گزارے۔ میرا جب بھی لندن جانا ہوا تو میں نے اس کو بہت زیادہ تبدیل ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ 1988ء کی بات ہے کہ جب میں لندن گیا تو میں نے سوچا کہ اس بار ان جگہوں کو دیکھا جائے کہ جہاں میں رہا تھا۔ میں ٹیوب سے ساؤتھ وڈفورڈ گیا۔ جب سٹیشن سے باہر آیا تو لاہورا سنگھ کی درزی کی دکان اس طرح سے موجود تھی۔ میں جب دکان میں داخل ہوا تو وہاں دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ "لاہورا سنگھ جی کہاں ہیں؟" اس پر دونوں نے مجھے چونک کر دیکھا۔ پھر میں نے بتایا کہ 1970ء میں جب میں یہاں ہاسٹل میں رہتا تھا تو لاہورا سنگھ جی کے پاس آتے جاتے آنا جانا تھا۔ ان میں سے ایک ان کی بیوی اور دوسری بہو تھی۔ ان کی بیوی کو یاد آ گیا۔ بولیں کہ سردار جی اب بیمار ہیں' دکان پر نہیں آتے۔ دکان اسی طرح سے تھی' ہاں گاہک بدل گئے تھے۔ میں باہر نکل کر آیا تو پوسٹ آفس کو اس جگہ پایا۔ ہاں وہاں سینما کی جگہ اب مارکیٹ بن گئی تھی۔ میں پرانی یادوں کو لئے اپنے پرانے ہاسٹل گیا تو وہ سب اس طرح سے تھا۔ دن کا وقت تھا' طالب علم کالج گئے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے جا کر ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ بڑے بڑے شیشوں سے باہر کا منظر اب بھی اسی قدر خوبصورت تھا۔ وہی ڈائننگ ہال اور وہی ٹی وی لاؤنج۔ اخبارات بھی اسی طرح سے بکھرے ہوئے تھے۔ مگر یہ 1970ء نہیں 1988ء تھا۔ میں شاید گھنٹہ بھر اس طرح بیٹھا رہا۔ اور گزرے زمانہ کو اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھتا رہا۔ جب میری یادیں ختم ہوئیں تو میں خاموشی سے اٹھا' اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر آیا۔ میرے لئے مکانات

وہی تھے' صرف مکین بدل گئے تھے۔ اور میں ان کی تلاش میں آیا تھا مگر انہیں نہ پا کر اب اداسی کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔

اور 1992ء میں جب میں 1976ء کے بعد واپس بوخم لوٹا تو دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی کہ دیکھوں شہر بدلا یا نہیں۔ شہر یقیناً تھوڑا بہت بدل گیا تھا۔ میرے قیام کے دوران نئے نئے ہاسٹل بنے تھے۔ یونیورسٹی کی عمارتیں نئی تھیں اس وقت ان کے اردگرد چھوٹے چھوٹے پودے تھے۔ اب یہ تن آور درخت بن کر عمارتوں کو اپنی گھنی شاخوں میں چھپا رہے تھے۔ سبزہ اور درختوں میں اضافہ ہوا تھا۔ میں یونیورسٹی کی عمارتوں میں گھومتا رہا۔ مگر اب وہاں کوئی بھی شناسا چہرہ نہ تھا۔ یونیورسٹی کا کیفے ٹیریا جہاں شوروغل و ہنگامہ رہتا تھا' ہال جہاں سیاسی تقریریں ہوتی تھیں' میزوں پر مارکس و لینن کی کتابوں کے ڈھیر ہوتے تھے' وہاں اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ ہاں شوروغل اور ہنگامہ ضرور تھا۔ آنے والے اپنی دنیا آپ بنا رہے تھے۔ انہیں اس ماضی سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ جس کی تلاش میں' میں یہاں آیا تھا۔

میں یونیورسٹی سے نکل کر اس عمارت کی طرف چلا کہ جس میں ہم رہا کرتے تھے۔ اس کا نام بھی دلچسپ تھا "الو کے پیڑ والی گلی" راستے وہی تھے۔ خاموش اور اداس۔ شاید میرے لئے۔ میں نے باہر کھڑے ہو کر اپنے اس فلیٹ کو دیکھا کہ جہاں ہم نے کچھ سال گزارے تھے۔ سب کچھ اسی طرح سے تھا' بس یہ کہ اب ہم یہاں نہیں تھے۔ میں اس طرح خاموشی سے پلٹا اور یونی سنٹر کی دکانوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہاسٹلوں میں ایک وقت کس قدر دوست رہتے تھے' اب ان کی جگہ دوسرے لوگ اس طرح سے رہ رہے ہوں گے۔ سامنے والے ہاسٹل کے پہلے فلور پر زبیر احمد فردوسی رہتے تھے' میرے حیدر آباد سندھ کے دوست' وہ اکثر کھڑکی میں کھڑے باہر کا نظارہ دیکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس لئے آتے جاتے ان سے دور سے سلام دعا ہوتی تھی۔ وہ کھڑکی کھلی تو اس وقت بھی تھی۔ مگر خالی۔ اور زبید احمد فردوسی حیدر آباد کے ایک قبرستان میں محو خواب ہیں۔ پھر میرا دل چاہا کہ میں فلیٹوں والی بلڈنگ میں جاؤں اور راجہ کے فلیٹ کی گھنٹی بجاؤں۔ مگر یہ سب بے سود تھا کیونکہ راجہ اب وہاں نہیں ہے'

وہ کراچی میں آغا خاں ہسپتال میں پروفیسر ہے۔ ہاں یونس خاں اب تک بوخم میں تھے۔ میں نے فون کیا' انہیں تھوڑی دیر کے لئے حیرت ہوئی اور پھر بولے آ جاؤ' میں انتظار کر رہا ہوں۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہیں اس طرح سے پایا سوائے اس کے کہ چہرے پر اب لمبی داڑھی ہے اور توند نکل آئی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پروفیسر بن چکے ہیں۔ میں ان کے ساتھ دو تین گھنٹے رہا اور پھر وہی سٹیشن پر چھوڑنے آئے۔

میں سوچنے لگا کہ یہ کیا بات ہے کہ جہاں انسان کا گھر ہوتا ہے' وہیں اسے تحفظ اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے ہی گھر چھوٹتا ہے' انسان اس شہر اور اسی جگہ میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لئے جب بھی میں ان شہروں میں گیا کہ جہاں میں نے کچھ وقت گزارا تھا اور جہاں میرے رہنے کا ٹھکانہ تھا' تو ان شہروں میں سڑکوں' مکانوں' راستوں اور عمارتوں کی موجودگی کے باوجود خود کو اجنبی پایا اور میں جب بھی وہاں سے پلٹا دل پر ایک بوجھ لئے ہوئے۔

بس ایک بار پھر جھٹکے سے رکی۔ کسی نے زور سے کہا۔ "نوائی" آگیا ہے۔ نوائی' میں نے باہر جھانک کر دیکھا' یہ تو وہی جگہ ہے کہ جہاں سے ہم ریل میں سوار ہو کر پاکستان کے لئے گئے تھے۔ بس اسٹینڈ کے سامنے ہی نوائی کا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ میں نے دور ہی سے کھڑکی سے اسے دیکھ لیا' شاید یہ اس وقت بھی ایسا ہی ہو گا' اب مجھے اس وقت کی یاد نہیں تھی' دیکھنے میں نوائی چھوٹا سا شہر' یا قصبہ معلوم ہوتا تھا' بس یہاں تھوڑی دیر رکی اور پھر اسی رفتار سے چل پڑی۔

میں سوچنے لگا کہ میں نے کچھ زیادہ آوارہ گردی نہیں کی۔ مگر آخر میں کیوں واپس آگیا' اور کیوں انگلینڈ' جرمنی یا امریکہ و کینیڈا میں مستقل نہیں رہ گیا؟ بہت سے دوست آج بھی یہ سوال کرتے ہیں اور کچھ تو خاصہ مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ میرے کتنے ساتھی ہیں۔ جو یورپ میں رہ گئے اور واپس نہیں آئے۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ میں کیوں آگیا؟ ہاں واپس آنے کے بعد ایک بار میں نے پھر سے واپس جانے کی کوشش ضرور کی۔ اس بار امریکہ کے لئے' یہ 1982ء کی بات ہے کہ میں امریکہ گیا' میرے ساتھ میری بیٹی عطیہ تھی۔ جو اس وقت 7 سال کی تھی۔ جب ہم سان

فرانسسکو کے ائیرپورٹ پر اترے تو امیگریشن سے گزر کر جب کسٹم کے پاس آئے تو وہ ہمیں اور ہمارے سامان کو علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ اور خوب سامان کی جانچ پڑتال ہوئی۔ اس قسم کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں' امریکہ مجھے پسند نہیں آیا۔ گھومنے کے لئے تو اچھا ہے مگر رہنے کے لئے شاید ہر ایک کے لئے نہیں۔ میں ڈھائی مہینہ بعد وہاں سے آ گیا۔ اب جب بھی دوست احباب کینیڈا یا امریکہ میں آباد ہونے کا مشورہ دیتے ہیں' تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ شاید اب میں تھک گیا ہوں اور جہاں ہوں وہیں رہنا چاہتا ہوں۔ اب تو لاہور سے کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اگرچہ اس وقت میں بیروزگار ہوں اور دوسرے شہروں میں روزگار کے مواقع ہیں مگر میں یہیں انتظار میں ہوں کہ کچھ کام مل جائے اور اب زندگی لاہور ہی میں گزار دوں۔

جس رفتار سے بس جا رہی تھی۔ اس رفتار سے میں سوچ رہا تھا۔ باہر سورج کی تمازت بڑھ گئی تھی اور ہوا بھی گرم ہو گئی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اسی راستہ سے ہم 1952ء میں گزرے تھے۔ جب بس کا رخ دوسری جانب تھا اور آج بس کے رخ کے ساتھ ہی میرے خیالات کا رخ بھی مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف ہے اور میرے ذہن میں وہ واقعات تیزی سے نکل کر آ رہے ہیں کہ جو کبھی کے روپوش ہو چکے تھے۔ میں نے بس میں مسافروں پر نظر ڈالی۔ ان میں سے کچھ وہ تھے کہ جو اپنے گھر جا رہے تھے' اور کچھ وہ تھے کہ جو کاروبار و کام کاج کی غرض سے جا رہے تھے۔ جو گھر جا رہے تھے وہ واپسی کے تصور سے خوش تھے اور کام کاج کے لئے جانے والے وہاں سے جلدی لوٹنے کی آرزومند تاکہ کام ہوتے ہی وہ دوبارہ اپنے گھروں کا رخ کریں۔ یہ گھر بھی کیسی پناہ گاہ ہے۔ ہر فرد تھک ہار کر اس کی آغوش میں پناہ لینے کا خواہش مند' کہیں چلے جائے' کس قدر آرام سے رہئے' مگر گھر کی واپسی ہمیشہ اداس لمحوں کو خوش کر دیتی ہے' گھر میں قدم رکھا اور ساری کلفتیں دور ہوئیں۔

مگر میں کیوں واپس ٹونک جا رہا تھا' میرا تو اب وہاں کوئی گھر نہیں' وہ گھر جو کبھی ہمارا تھا' اب کسی اور کا ہو گا' پھر کس لئے؟ اپنے بچپن کی تلاش میں کہ جو وہاں کی گلیوں' راستوں اور چوراہوں میں کھو گیا ہے۔ چوالیس سال بعد کیا وہ گلیاں اور راستے

اس طرح سے ہوں گے کہ جیسے میں چھوڑ گیا تھا یا وقت کے ساتھ وہ بھی بدل گئے ہوں گے۔ کیا میں انہیں پہچان سکوں گا یا نہیں؟

بس گھنٹہ گھر کے قریب جا کر رکی۔ جب میں بس سے اترا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں ہوں؟ گھنٹہ گھر کے قریب ایک زمانہ میں کھلی جگہ ہوتی تھی، مگر اب ایسا نہیں تھا دکانیں، اور ان کے پھیلاؤ نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں اناج کے بیوپاریوں کی دکانیں ہوتی تھیں جو دکانوں سے باہر چبوتروں پر اناج کے ڈھیر لگائے بیٹھے رہتے تھے، اب ان دکانوں کا نام و نشان باقی نہیں تھا۔ یہاں سے ہم سائیکل رکشہ میں سوار ہوئے۔ میں نے کہا کہ “قافلہ چلنا ہے، مسجد کے سامنے جو دروازہ ہے اس کے اندر سے ہو کر۔”

سائیکل رکشہ میں سوار ہو کر چلے، تو میں پہچاننے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ گلی گزر گئی کہ جس سے ہو کر میں مدرسہ خلیلیہ جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد کوتوالی آئی مگر یہ بھی عمارتوں کے اندر دب چکی تھی۔ اس کے سامنے چبوترہ غائب تھا اور آگے چلے تو بساطیوں کی دکانیں بھی اب نہیں تھیں، یہاں سے میں کپڑے کی گیند خریدتا تھا، جس سے گیند بلا کھیلا جاتا تھا۔ جب رکشہ والے نے مسجد کے سامنے دروازہ میں رکشہ موڑا تو میں حیران رہ گیا کہ اس کے سامنے کی کھلی جگہ کہاں گئی۔ اب وہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں اور مکانات تھے اور تنگ گلیاں، میں بھول گیا کہ نانی کی حویلی میں جانے کے لئے کون سا راستہ ہے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ یہاں کنواں ہوتا تھا، وہ کہاں ہے؟ رکشہ والے نے کہا کنواں تو بھر دیا گیا ہے۔ اب اس پر دکان ہے۔ لہٰذا ہم تنگ گلی سے ہوتے ہوئے جب مڑے تو میں نے دیکھا کہ حویلی کا پھاٹک مکانوں میں گھرا نظروں سے اوجھل ہے۔

جب گھر میں داخل ہوا تو پتہ چلا کہ اب یہاں سریوں کا کارخانہ ہے، پورے صحن میں لوہا بکھرا ہوا تھا اور مزدور ان کو کوٹنے میں مصروف تھے۔ دائیں جانب والا مکان ماموں نے اپنی زندگی ہی میں بیچ دیا تھا۔ اب وہاں کسی نے دو منزلہ مکان بنا لیا تھا۔ گھر میں جانے کے لئے ڈیوڑھی کا راستہ بند تھا۔ وہاں جو کام کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ

اب اس میں سکول چلتا ہے۔ اس کا راستہ دوسری طرف سے گلی میں ہے۔ اسی دوران وہ صاحب جنہوں نے مکان خریدا تھا اور اب سکول چلاتے ہیں وہ آ گئے اور دوسری طرف جا کر گلی میں مکان کا دروازہ کھولا۔ ہر چیز اسی طرح تھی۔ میں چبوترے پر سے ہوتا ہوا دالانوں میں گیا۔ اندر کے دالان میں دونوں جانب کی کوٹھریاں بند تھیں۔ دالانوں میں کچھ نہیں تھا کوئی فرنیچر یا سامان، میں سردیوں میں انہی دالانوں میں جبکہ روئی کے بھرے پردے ڈال دیئے جاتے تھے۔ نانی کے ساتھ لیٹ کر کہانیاں سنتا تھا۔ اب یہاں خاموشی تھی۔ اس کے سارے مکین جا چکے تھے۔ سامنے والا حصہ بھی خالی تھا، چھوٹے ماموں کے کبوتروں والی کوٹھری بھی خالی تھی۔ میں نے کہا کہ ذرا اوپر والا حصہ بھی دیکھ لوں، تو پتہ چلا کہ اس کا راستہ دوسری طرف ہے اور دروازے میں تالا پڑا ہے۔

میں وہاں کی تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے دوبارہ سے سڑک پر آئے تو میں نے محسوس کیا کہ میرا ایک خواب تو ٹوٹ گیا، یہ گلیاں میرے لئے اجنبی تھیں کیونکہ یہ میرے بعد بنیں، ان گلیوں نے میرے زمانہ کا نقشہ بدل دیا، اس نے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا، یہی وجہ تھی کہ جب میں وہاں سے چلا تو نانی کے مکان کے علاوہ اس کے اردگرد کا پورا ماحول میرے لئے نیا تھا۔

میں نے رکشہ والے سے کہا: "رحمو کی مسجد کے قریب" مرجنیا بیگم کی حویلی کے پاس چلو۔ سڑک کے دونوں جانب دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ وہ جگہ بھی اب نہیں تھی کہ جہاں شام کو گاؤں والیاں سبزی ترکاری بیچنے کے لئے آتی تھیں۔ یکدم کچہری کا دروازہ آیا۔ اکثر میں اس راستہ سے مدرسہ جایا کرتا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی لوہے کے سریئے پڑے تھے۔ وہ جگہ بھی شاید کارخانہ میں بدل گئی تھی۔ بازار سے نگینہ بنانے والوں کی دکانیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ اور وہ بھڑبونجا بھی نہیں تھا کہ جو صبح صبح چنے بھونا کرتا تھا اور جس کی مہک سے یہ پورا بازار مہکتا تھا۔ رکشہ والا لوہاروں کی گلی سے ہوتا ہوا چلا۔ سامنے مجھے اپنا مکان نظر آیا۔ جب مڑے تو میں نے دیکھا کہ وہ میدان کہ جہاں لوہار گاڑیوں پر پہیئے چڑھاتے تھے، وہاں بھی مکان بن گئے ہیں اور

میدان میں مزار کا حصہ دب کر ایک طرف ہو گیا ہے۔

مسجد کے سامنے ایک صاحب بیٹھے تھے، کہنے لگے کہ یہ مکان میں نے خرید لیا ہے، پہلے یہاں ایک بلوچی رہتا تھا، مزید تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ اس مسجد کے مؤذن ہیں۔

میں نے سوال پوچھا کہ ایک زمانہ میں میستا بھیا مؤذن ہوتے تھے۔ کہنے لگے کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

انہوں نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ ڈیوڑھی تو اب وہاں نہیں تھی۔ مکان میں داخل ہوتے تو دیکھا کہ دائیں جانب جو حصہ تھا، اس پر نیا مکان بنا ہوا ہے۔ اب مکان میں صرف سامنے والا دالان اور بائیں دالان باقی تھے۔ نیم کا پیڑ کاٹ دیا گیا تھا، جوہی کی دونوں بیلیں بھی نہیں تھیں۔ چھت پر جانے کے لئے زینہ اور سیڑھیاں بھی نہیں تھیں۔ مکان کیا تھا، ایک کھنڈر تھا۔ میں نے سوچا کہ میں یہاں اپنا بچپن کہاں تلاش کروں؟ نہ وہ باورچی خانہ ہے، نہ اپلوں کی کوٹھری ہے، نہ ڈیوڑھی ہے، اور اس کے ساتھ والا کمرہ، نہ وہ جگہ کہ جہاں ہم رہے۔ میں یہاں کہاں اپنا ماضی دیکھوں، اس کے تو نشانات بھی مٹ گئے ہیں۔ چند ہی منٹ میں، میں باہر نکل آیا۔ سامنے والے میدان بھی، اب میدان نہیں تھا، وہاں بھی مکانات تھے۔ مسجد کے ساتھ والا کنواں بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد میں تالا پڑا ہوا تھا، پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت کھلی رہتی تھی۔ اب اس کے مینار کے چاروں طرف لاؤڈ سپیکرز بھی تھے اور میستا بھائی کی سہانی آواز کی جگہ چیخ و پکار سے بھرپور آواز ہوتی ہو گی۔

میرا دل چاہا کہ میں کسی طرح سے چھت کے اوپر چلا جاؤں اور وہاں کھڑے ہو کر اس میدان کو ایک بار اور دیکھوں کہ جہاں گاڑیوں کے پہیوں پر لوہے کے فریم چڑھائے جاتے تھے مگر اوپر جانے کی سیڑھیاں ہی نہ تھیں۔ میں چند منٹ اسی طرح خاموشی سے صحن میں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ ادھر چبوترہ ہوتا تھا اور اس کے کونے میں چولہا جہاں اماں کھانا پکاتی تھیں، سامنے والے حصے میں دادا اور دادی ہوتے تھے، دوسرے حصے میں کہ جہاں چھوٹے چچا رہتے تھے، اسے نئے مالک نے بیچ دیا تھا۔ لہٰذا

میں نے سوچا کہ یہاں اور زیادہ ٹھہر کر میں کیوں خود کو اداس کروں۔

باہر نکل کر رکشہ والے سے کہا کہ محسن میاں کا گھر جانتے ہو کہاں ہے؟ ٹونک ابھی بھی چھوٹا شہر ہے، لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں، اس لئے وہ لے کر چلا اور بازار سے ہوتا ہوا بڑے کنویں کے پاس گلیوں سے گزرتا ہوا، ایک مکان کے سامنے لے آیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا کہ محسن میاں ہیں، میں ان کا پھوپھی زاد بھائی ہوں۔ محسن یہاں تو نہیں تھے مگر گھروالوں نے اندر بلایا اور سب اس طرح اکٹھے ہوئے کہ جیسے کوئی عجیب مخلوق آئی ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں خبر پھیل گئی کہ پاکستان سے لوگ آئے ہیں؟ رشتہ دار جمع ہونے لگے میری پھوپھی زاد بہن اختری بی بھی آ گئیں۔ سب نے پاکستان میں رہنے والے رشتہ داروں کی خیریت معلوم کرنی شروع کر دی۔ ایک بزرگ خاتون نے بڑی محبت سے کہا۔ تمہیں تو یاد نہیں ہوگا مگر میں جب بھی تمہارے گھر جاتی تھی تو اچھے چچا یعنی تمہارے والد مجھے ایک روپیہ دیا کرتے تھے اختری بی نے پوچھا۔ پاکستان میں سب خیریت سے تو ہیں۔ پھر کہنے لگیں روز لڑائی جھگڑے کی خبریں آتی ہیں۔ تم سے تو ہم اچھے ہیں اپنے ملک میں آرام سے پاؤں پسار کر سوتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سندھ میں سندھی، مہاجر فسادات زوروں پر تھے۔ ان تک خبریں پہنچتی رہتی تھیں اتنے میں محسن میاں بھی آ گئے، بڑی محبت سے ملے، کہنے لگے کب تک رہوں گے، تمہیں نذر باغ لے چلتے ہیں اور زیادہ ٹھہرو تو بیاس ندی کی سیر ہو جائے۔ میں نے کہا کہ بس ابھی چند گھنٹوں بعد ہی جانا ہے، شہر کو دیکھنے اور آپ سے ملنے آ گئے۔ اتنے میں کچھ خواتین اور آ گئیں ان میں سے چند نے خطوط دیئے کہ ان کے رشتہ داروں تک پہنچا دوں۔ ایک طویل عرصہ بعد جب رخصت ہوا جائے تو جذبات امڈ ہی آتے ہیں۔ دور کے رشتہ دار اور بھی تھے، مگر ان سے ملنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے سب سے رخصت ہو کر بس اسٹینڈ پر آئے۔ ٹکٹ خرید کر بس میں بیٹھے تھے کہ عبدالمعبود نے کہا یہ بس دیر سے چلے گی، دوسری ترنت جا رہی ہے، اس میں چلتے ہیں۔ میں بس میں جیسے ہی بیٹھا اچانک میرے ذہن میں آیا کہ جن بزرگ خاتون سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو بچھن بی تھیں۔ ایک دم ماضی کی تصویر ذہن میں آ گئی، میں

چھوٹا سا تھا اس وقت بھی کتابوں سے دلچسپی تھی’ ہم نے ان کے گھر کے ایک کمرے میں لائبریری بنائی تھی۔ ایک دن میں سر جھکائے کتابیں اٹھائے جا رہا تھا یہ چبوترے پر کھڑی تھیں’ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا’ خوبصورت اور حسین۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔ “ارے ذرا نظریں اٹھا کر ہمیں بھی تو دیکھ لیا کرو۔” میں نے چاہا کہ میں بس سے اتر کر فورا” ان کے پاس جاؤں اور کہوں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے مگر اب دیر ہو چکی تھی اور بس ترنت جے پور کی طرف جا رہی تھی۔

☆

تاثرات

زندگی کے اس موڑ پر جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں اور اپنی شخصیت کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے اپنے میں ایک کمزوری کا زبردست احساس ہوتا ہے اور وہ ہے میری جذباتیت۔ میں نے جذبات میں آکر ہمیشہ ایسے فیصلے کئے کہ جن کا مجھے نقصان ہوا۔ اگر میں جذبات پر قابو پا لیتا۔ اور ٹھنڈے دل سے حالات کا تجزیہ کر کے فیصلے کرتا تو شاید مجھے بہت سی مصیبتوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ مگر مجھ میں یہ جذباتیت کیوں ہے؟ میں کیوں کسی غلط بات پر برافروختہ ہو جاتا ہوں؟ اور کیوں اسی وقت اپنی رائے دیتا ہوں؟ پتہ نہیں اس کا تعلق میری شخصیت کے کون سے پہلو سے ہے۔ کہتے ہیں کہ پٹھانوں میں غصہ، جوش اور جذبات کی کوئی علیحدہ سے رگ ہوتی ہے، اور جب اسے غصہ آتا ہے، یا جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو وہ نتائج کو نہیں دیکھتا ہے۔

میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا میری زندگی کامیاب رہی؟ اس بات کو میں پوری طرح سے سمجھتا ہوں کہ کامیابی کے معیار اور پیمانے ہر ایک کے لئے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن کامیابی کے لئے ہمیشہ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ سوال میرے لئے اہم رہا ہے کہ کیا زندگی میں حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہئے یا ان سے لڑنا چاہئے؟

مجھے یاد ہے کہ 1988ء میں میں جب اپنے دوست خضر انصاری سے ملنے ونڈسر گیا، تو خضر نے ہی سوال کیا۔ کیا یہ ہر ایک انسان کا حق نہیں کہ وہ اس زندگی سے جو اسے ایک بار مل رہی ہے، لطف اندوز ہو۔ اس لئے اگر معاشرہ اس سے سمجھوتہ کا

مطالبہ کرتا ہے تو کیا حرج ہے۔ کیا تاریخ میں یہ نہیں ہوا کہ باغیوں کو کچل دیا گیا انہیں نیست و نابود کر دیا گیا۔ فرض کرو' اگر آج تاریخ میں ان کا نام ہے' لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ مگر ان کا فائدہ انہیں کیا؟ مرنے کے بعد اگر اسے آسمان تک بھی لے جاؤ تو اس کی ذات کو کیا؟ کیا یہ ضروری ہے کہ انسان دوسروں کے لئے مر جائے خود کو قربان کر دے' اپنی خواہشات کو کچل دے اپنے خاندان کو محروم بنا دے؟ اور پھر بس تاریخ کے صفحات پر اس کا نام باقی رہ جائے۔ اور پھر یہ اعزاز بھی ہر ایک کو نہیں مل جاتا ہے۔

خضر نے جو دلیل دی وہ اپنی جگہ۔ اس لئے میں نے اس پر غور کیا۔ اور سوچا کہ آخر کیوں ایسے انسان ہیں۔ جو اس دنیا کی نعمتوں کو ٹھکراتے ہیں۔ اپنی زندگیوں کو اصولوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ کیوں۔ کس لئے؟ کیا شہرت کی خاطر۔ یا اس کی خاطر کہ تاریخ میں ان کا نام رہے۔ یا اس کے علاوہ بھی کوئی اور جذبہ ہے جو انہیں اپنی بات پر قائم رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بھی ایک خود غرضانہ خواہش ہے۔ لیکن شاید ایسا نہیں ہے جو لوگ معاشرہ کی روایات' اقدار اور اداروں سے بغاوت کرتے ہیں۔ ان میں سچائی کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا نشہ اس قدر زور آور ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کو اس کی فکر نہیں ہوتی ہے کہ اس کا کیا بنے گا۔ وہ صرف اپنے جذبہ کا اظہار چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک فنکار اپنے تخلیقی جذبہ کے نشہ میں غربت و افلاس' ذلت و خواری اور الزام تراشی۔ ہر چیز سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اسے نہ تو شہرت کی پرواہ ہوتی ہے۔ اور تاریخ میں اپنے نام کو دیکھنے کی۔ نہ معاشرے کی پرواہ ہوتی ہے۔ اور نہ لوگوں کے احساسات کی۔ یہ جذبہ اس کی شخصیت کو ابھارتا ہے اور اس میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس کے سہارے وہ تکلیف و اذیت کو برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ موت بھی اسے خوف زدہ نہیں کر سکتی ہے۔

اس لئے مجھے باغی لوگ پسند ہیں۔ وہ لوگ کہ جو قدیم اور مستحکم روایات و

عقائد۔ رسوم و رواج سے بغاوت کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو ظالم بادشاہوں۔ مطلق العنان آمروں اور رعونت زدہ افراد سے بغاوت کرتے ہیں۔ ان شخصیتوں کی زندگی میں جو دلکشی، خوبصورتی اور دل آویزی ملتی ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے اکثر ناکام ہوئے، مگر انہوں نے جمود کو توڑا۔ اور مستحکم عمارت پر ایک ضرب کاری لگائی یہ وہ لوگ ہیں کہ جو تاریخ کے عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تاریخ میں دو قسم کے افراد رہے ہیں: ایک وہ جو کہ معاشرے کی شرائط پر زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ اپنی شرائط پر۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان میں سے کون صحیح ہے۔ مگر میں نے خود اپنی شرائط پر زندگی گزاری۔ اور کوشش یہی ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی کروں۔

پوری زندگی میں اور اس وقت بھی ایک احساس مجھے ہمیشہ رہا ہے؟ عدم تحفظ کا جب ہم پاکستان آئے ہیں تو پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو گا؟ جب میں برابر ملازمتوں سے نکالا جاتا رہا اور تلاش معاش میں سرگرداں رہا تو اس وقت بھی پتہ نہیں تھا کہ کل کیا ہو گا؟ جب میں لندن کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرتا تھا تو اچانک میرے اندر خوف پیدا ہوتا تھا کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ اگر پیسے ختم ہو گئے تو کیا ہو گا؟ یہی صورت جرمنی میں رہی بے یقینی کی کیفیت اندر سے پیدا ہونے والا ڈر جس کی وجہ سے میں اچانک خود کو انتہائی کمزور سمجھنے لگتا تھا۔ پھر یہی کچھ واپس آ کر ہوا کہ جب سندھ یونیورسٹی سے معطل ہوا تو اچانک خود کو مجبور پایا۔ آج میں پھر اسی کیفیت سے دوچار ہوں۔ ایک ایسی کیفیت کہ جس میں امید۔ اور یقین کی کوئی کرن نظر نہیں آتی ہے میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ میں اس دور سے کیسے گزروں گا؟ گزر سکوں بھی کہ نہیں۔ لیکن جہاں میں خود کو تنہا پاتا ہوں۔ اور مجھ پر اور اداسی و مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو ایسے میں چند دوست ہیں کہ جو ہمیشہ سہارا بن کر آتے ہیں۔ میں نے اس غیر یقینی کی کیفیت کو انہیں دوستوں کے سہارے جھیلا ہے۔ یہی میرے رشتہ دار ہیں۔ اور یہی میرے ساتھی۔ اور یہی چند لوگ ہیں کہ جو جینے کا سہارا دیتے ہیں۔

لیکن کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ یہ در در کی ٹھوکریں کھانا میرا ہی مقدر کیوں ہے؟ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا انسان حالات کے ریلے ہیں اپنی مرضی کے خلاف بہتا چلا جاتا ہے۔ یا اسے اس پر قدرت ہے کہ وہ حالات کے اس سیلاب کو روک سکے؟ در در کی ٹھوکریں کھانے والا ہمیشہ اس کا متلاشی ہوتا ہے کہ کسی جگہ تو وہ ٹھہر جائے۔ کچھ سستا لے آرام کر لے۔ اور شاید ہمیشہ کے لئے قیام کر لے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ میری آخری آرام گاہ کہاں ہو گی؟ یہ ضرور ہے کہ ابھی بھی مجھ میں تھکن کا احساس نہیں ہے۔

ان تمام زخموں کے باوجود جو میں نے لوگوں سے کھائے ہیں۔ میرے اندر بغاوت کرنے، زندہ رہنے، اور مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہے۔

اکثر لوگ مجھ سے یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ میں باہر کیوں نہیں رہ گیا۔ واپس کیوں آیا؟ اس کا تعلق اس سوال سے ہے کہ انسان کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں اگر باہر رہتا تو یقیناً ایک اچھی زندگی تو گزار لیتا، مگر میں نے یہاں رہ کر جو کام کیا ہے وہ نہیں ہوتا۔ اس لئے آج اگر کوئی مجھ سے آ کر یہ کہتا ہے کہ اس نے میری تحریروں سے کچھ سیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔

پاکستان میں زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا تعلق کسی نہ کسی گروہ یا لابی سے ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس لابی کے نظریات اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنا چاہئے ورنہ جو ان سے تعلق نہیں رکھتا ہے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میں اس کا شکار اس لئے ہوں کہ میرا کسی لابی یا کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے اس ملک کے دانشوروں نے مجھے نظر انداز کر رکھا ہے۔ اس حد تک کہ اکثر تو میری کتابیں بھی نہیں پڑھتے کہ کہیں ان سے متاثر نہ ہو جائیں۔ لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ نوجوان میری تحریریں شوق سے پڑھتے ہیں۔ خصوصیت سے سندھ، بلوچستان اور سرائیکی علاقے ہیں مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ میں نے اس نوجوان نسل کے ذہنوں کو تبدیل کرنے میں حصہ لیا ہے۔

سرکار و دربار میں میری تحریروں کی پذیرائی نہیں اس پر مجھے خوشی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے ایک بار اس طرح سے ہوا کہ جب گوئٹے کی ملازمت ختم ہو رہی تھی تو میں نے سوچا کہ چلو ہائڈل برگ میں جو اقبال چیئر ہے اس کے لئے درخواست دے دی جائے۔ اگر وہاں کام ہو جائے گا تو تین چار سال آرام سے گزر جائیں گے اور وہاں رہ کر کچھ کام بھی ہو جائے گا۔ میں نے درخواست دی۔ انٹرویو کے لئے بلاوہ آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کام کیا ہے۔ شاید اس کی قدر ہو اور چونکہ مجھے جرمن زبان آتی ہے۔ اس لئے اس کا مجھے فائدہ ہو گا۔ جب میں اسلام آباد میں انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مضمون کے ایکسپرٹ کی حیثیت سے وہاں احمد فراز اور افتخار عارف بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اس پر اشتیاق حسین قریشی کا واقعہ یاد آیا کہ جب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کے لئے درخواست دی تو انہیں کہا گیا کہ وہ انٹرویو دیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میرا انٹرویو کون لے گا؟ اگر ہماری بیوروکریسی میں پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو انٹرویو کے بجائے صاحب علم لوگوں کو ایسے عہدوں کے لئے پیش کش کرتے۔

ہائڈل برگ کی یہ چیئر خالص علمی مضامین کے لئے ہے۔ اس میں پاکستان کی تاریخ و سیاست و تحقیق و تدریس شامل ہے۔ اس کا علم انٹرویو لینے والوں کو بالکل نہ تھا۔ ان دو کے علاوہ ایک صاحب فارن سروس کے تھے، اور ایک شعبہ تعلیم کے۔

اس انٹرویو میں مجھ سے جو سوالات پوچھے گئے وہ یہ تھے:

"آپ جرمنی جا کر پاکستان کلچر کے فروغ کے لئے کیا کریں گے؟"

میں نے کہا۔ مگر یہ عہدہ کلچر کے فروغ کے لئے نہیں تحقیق و تدریس کے لئے ہے۔

"مگر پھر بھی آپ کو کلچر کے لئے کچھ تو کرنا ہو گا۔"

میں نے جواب میں کہا کہ اس کے لئے آپ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی طرز پر وہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ کھولئے۔ اس کا نتیجہ پہلے سے تیار کیا جا چکا تھا تین امیدوار جو اس

میں منتخب ہوئے ہیں۔ ان تینوں میں میرا نام نہیں تھا۔

پاکستانی معاشرے میں روشن خیالی لوگوں کی جو منافقت ہے، اس کا تجربہ بار بار ہوا۔ خاص طور سے ان کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب روس میں تبدیلی آئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ کہ جو سکہ بند سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے انہوں نے راتوں رات اپنے نظریات بدل لئے اور کھلے عام یہ کہنے لگے کہ انہوں نے غلطی کی تھی اور اب مارکس و لینن کے خیالات کی انہیں کوئی ضرورت نہیں۔

ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں کہ جو روس کے عروج کے زمانہ میں اس کے سب سے بڑے حامی تھے اور جو سوشلسٹ ملکوں کی تفریح کے بعد ان کے قصیدے پڑھتے تھے اب جب سے وہاں سے روزی کے دروازے بند ہوئے ہیں۔ تو یہ لوگ اب کسی دوسرے سرپرست کی تلاش میں ہیں۔ ان میں سے اکثر گناہوں سے توبہ کر کے پکے و سچے مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور کچھ اب سرمایہ داری اور آزاد منڈی کی تعریف و توصیف میں مصروف ہیں۔

پتہ نہیں، مگر ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ روایت رہی ہے کہ جب زندگی کے آخری دن قریب آتے ہیں۔ تو ترقی پسند حضرات مذہب میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں ہمارے ہاں بے شمار ہیں۔ ان کی اس منافقت اور دوغلی پالیسی کی وجہ سے یہ لوگ معاشرے میں اپنی جڑیں نہیں جما سکے۔ میں ان میں سے کئی نوجوانوں کو جانتا ہوں کہ جو بڑے جذبہ اور شوق سے روشن خیال تحریکوں میں شامل ہوئے، آج یہ سارے نوجوان اپنے لیڈروں کی دھوکہ دہی کے باعث ذلیل و خوار ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں کہ جن کی تعلیم ادھوری رہی۔ وہ بھی ہیں کہ جنہیں گھروں سے نکال دیا گیا۔ اور وہ بھی ہیں کہ جو مالی طور پر دوسروں کے محتاج ہیں۔ ترقی پسند لیڈروں نے ان نوجوانوں کو بے سہارا چھوڑ کر خود کامیاب کیریئر اپنا لئے ہیں۔ کچھ غیر سرکاری ملازمتوں میں ہیں۔ کچھ صحافی دانشور بن گئے ہیں۔ کچھ تجارت میں پیسہ کما رہے ہیں۔ ان دانشوروں نے جس طرح سے معاشرے کو دھوکہ دیا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں ترقی

پسندوں اور روشن خیال کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔

حالات و ماحول انسان کو تنہائی پر مجبور کرتا ہے۔ زندگی کے اس دوستوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے، اور انسان دن بدن تنہا و اکیلا ہوتا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کبھی وہ اداسی کا شکار ہوتا ہے اور کبھی زندہ رہنے کے لئے روشنی کی تلاش کرتا ہے۔ میں خود بھی اسی صورت حال سے دوچار ہوں۔ مثلاً یہ سطریں تحریر کرتے ہوئے جب میں کمرے کی کھڑکی سے جھومتے درختوں کی شاخوں کو رقص کرتے دیکھتا ہوں، تو یہ خوبصورت منظر مجھ میں امید و حوصلہ پیدا کرتا ہے، مگر جب یہ منظر نظروں سے غائب ہوتا ہے تو پھر اداسی و غم کی تہوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ اس وقت میں ان لوگوں کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں کہ جو محرومیوں کا شکار ہیں، جن کی پوری زندگی محنت و مشقت میں گزری مگر انہیں سکون و آرام کے لمحات میسر نہیں آئے۔ تو کیا ایسا ہی ہوتا ہے کہ عام لوگ اسی طرح سے اپنی خواہشات کو سینوں میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات و تمناؤں کو سمجھنے والا کوئی ہے یا نہیں۔ اور کیا ان کی تقدیر کبھی بدلے گی بھی یا نہیں؟ ایسے ہی خیالات مجھے افسردہ کر دیتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں پوری فضا مجھے اداسی میں لپٹی نظر آتی ہے۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں کہ جب میں اپنے غموں اور دکھوں کو بھی بھول جاتا ہوں۔ ایسے وقت میں مجھے اپنی تنہائی سے لگاؤ ہو جاتا ہے اور اس میں پناہ لے کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔

☆ ☆ ☆